ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی کا ترجمان
ISSN 2321-8339
سہ ماہی

تحقیقات اسلامی

علی گڑھ

رحمِ مادر کا اجرت پر حصول - اسلام کا نقطۂ نظر
محمد رضی الاسلام ندوی
اسلام کا نظامِ تکافل
مولانا اختر امام عادل قاسمی
عہدِ نبوی کا تعلیمی نظام اور موجودہ دور میں اس کی معنویت
پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی
موجودہ دور میں سیرت نگاری کے عمومی رجحانات
ڈاکٹر وارث مظہری
مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا تفسیری منہج
جناب ظفر احمد الاثری
تعارف وتبصرہ
مولانا محمد جرجیس کریمی
ڈاکٹر محمد شہاب الدین

ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی، علی گڑھ

ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی کا ترجمان

سہ ماہی

تحقیقاتِ اسلامی

علی گڑھ

جولائی ——————— ستمبر۲۰۱۳ء

مدیر

سیّد جلال الدین عمری

معاون مدیر

محمد رضی الاسلام ندوی

نبی نگر (جمال پور)، پوسٹ بکس نمبر۹۳، علی گڑھ-۲۰۲۰۰۲
Nabi Nagar (Jamalpur) P.O.Box: 93,ALIGARH-202002 (INDIA)

سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی علی گڑھ

جلد: ۳۲ شمارہ: ۳

شعبان ۱۴۳۴ھ ——— شوال ۱۴۳۴ھ

جولائی ——— ستمبر ۲۰۱۳ء

تحقیقاتِ اسلامی کے تمام شمارے www.tahqeeqat.net پر ملاحظہ کریں

ادارتی امور

موبائل : 09582050234

ای میل: tahqeeqat@gmail.com

mrnadvi@yahoo.com

انتظامی امور

فون : 0571-2902034

موبائل: 09897655171

ای میل: tahqeeqateislami@gmail.com

tahqeeqat_islami@yahoo.com

زرِ تعاون

اندرونِ ملک

فی شمارہ	۳۰ روپے
سالانہ	۱۲۰ روپے
پانچ سال کے لیے	۵۰۰ روپے
سالانہ (لائبریریاں وادارے)	۱۵۰ روپے

برائے پاکستان

سالانہ (انفرادی)	۲۰ ڈالر امریکی
سالانہ (ادارے)	۲۵ ڈالر امریکی

برائے دیگر ممالک

سالانہ (انفرادی)	۲۵ ڈالر امریکی
سالانہ (ادارے)	۳۰ ڈالر امریکی

طابع وناشر سید جلال الدین عمری نے بھارت آفسیٹ دہلی-۶ سے چھپوا کر
ادارۂ تحقیق وتصنیفِ اسلامی، نبی نگر (جمال پور)، علی گڑھ سے شائع کیا

فہرست مضامین

حرف آغاز

رحمِ مادر کا اجرت پر حصول — محمد رضی الاسلام ندوی — ۵
(موجودہ صورت حال اور اسلام کا نقطۂ نظر)

تحقیق وتنقید

اسلام کا نظامِ تکافل — مولانا اختر امام عادل قاسمی — ۱۹

بحث ونظر

عہدِ نبوی کا تعلیمی نظام — پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی — ۴۷
اور موجودہ دور میں اس کی معنویت
موجودہ دور میں سیرت نگاری کے عمومی رجحانات — ڈاکٹر وارث مظہری — ۷۳
(دعوتِ اسلامی کے حوالے سے)
مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا تفسیری منہج — جناب ظفر احمد الاثری — ۹۱

تعارف وتبصرہ

فتح الخبیر فی ما لا بد من حفظہ فی علم التفسیر — محمد رضی الاسلام ندوی — ۱۱۳
مختصر تاریخ ثقافتِ اسلامی — مولانا محمد جرجیس کریمی — ۱۱۴
اردو ادب کا تہذیبی تناظر — ڈاکٹر محمد شہاب الدین — ۱۱۵
خبرنامہ ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی (۴۸) — ۱۱۸

اس شمارے کے لکھنے والے

۱- مولانا اختر امام عادل قاسمی
مہتمم جامعہ ربانی، منورواشریف، سمستی پور (بہار)
ai_adil@rediffmail.com

۲- پروفیسر ظفرالاسلام اصلاحی
ڈپارٹمنٹ آف اسلامک اسٹڈیز، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ
zafarul.islam@gmail.com

۳- ڈاکٹر وارث مظہری
ایڈیٹر سہ ماہی 'ترجمان دارالعلوم' نئی دہلی-۲۵
w.mazhari@gmail.com

۴- جناب ظفر احمد الاثری (لندن)
asarizafar@hotmail.com

۵- مولانا محمد جرجیس کریمی
رکن ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، علی گڑھ
jarjees.karimi@yahoo.com

۶- ڈاکٹر محمد شہاب الدین
پروجکٹ فیلو، سینٹر فار ایڈوانسڈ اسٹڈی، شعبۂ اردو، مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ
mshahabalig@gmail.com

۷- محمد رضی الاسلام ندوی
سکریٹری تصنیفی اکیڈمی، جماعت اسلامی ہند، نئی دہلی-۲۵

رحمِ مادر کا اجرت پر حصول

موجودہ صورتِ حال اور اسلام کا نقطۂ نظر

——— محمد رضی الاسلام ندوی

موجودہ دور میں سماجی سطح پر جو نئے مسائل ابھرے ہیں ان میں سے ایک اہم مسئلہ وہ ہے جسے 'رحمِ مادر کا اجرت پر حصول' (Womb on Rent) یا قائم مقام مادریت (Surrogacy) کا نام دیا گیا ہے۔

مغرب میں فحاشی، اباحیت، زنا بالرضا اور کثرتِ اسقاط کے نتیجے میں عورتیں تیزی سے پیداواری صلاحیت (Reproductive Ability) سے محروم ہورہی ہیں۔ اس کا اندازہ Centre for Disease Control and Pevention کی ایک رپورٹ سے لگایا جاسکتا ہے، جس میں بیان کیا گیا ہے کہ ۲۰۱۰ء میں 7.3 Million عورتیں، جن کی عمریں ۱۵ سے ۴۴ سال کے درمیان تھیں، بچہ پیدا کرنے کے قابل نہیں تھیں۔ اس کے علاوہ مغربی ممالک میں بعض معاشرتی برائیوں کو قانونی جواز فراہم کردیا گیا ہے، مثلاً ہم جنس پرستی (Homosexuality) جس میں دو مرد یا دو عورتیں باہم رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوکر زندگی گزارتے ہیں۔ ایسے لوگ جو قدرتی یا اکتسابی طور پر اولاد سے محروم ہوں اور وہ اولاد چاہتے ہوں، ان کے لیے یہ طریقہ نکالا گیا کہ وہ پیداواری صلاحیت کی حامل کسی عورت کی خدمات حاصل کریں، مصنوعی طور پر اس کی بارآوری (Fertilization) عمل میں آئے، وہ حمل اور وضعِ حمل کے مراحل سے گزرے، پھر جو بچہ اس کی کوکھ سے نکلے، اسے وہ ان کے حوالے کردے۔

تاریخ اور موجودہ صورتِ حال

زمانۂ قدیم میں وہ جوڑے، جو شوہر یا بیوی کے اعضائے تولید میں کسی نقص کی بنا پر اولاد سے محروم رہتے تھے، خاندان یا اس سے باہر کے کسی بچے کو لے کر اسے اپنا بیٹا بنا لیتے تھے۔ لیکن ماضی قریب میں میڈیکل سائنس کی غیر معمولی ترقی کے نتیجے میں ایسے افراد میں بھی صاحبِ اولاد ہونے کی امید جاگی اور اس کے لیے نت نئے طریقے اختیار کیے گئے۔ ان میں سے ایک اجرت پر رحمِ مادر کا حاصل کرنا ہے۔

گزشتہ صدی کے ربع اخیر میں اس میدان میں انقلابی کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ ۱۹۷۱ء میں نیویارک میں تجارتی بنیادوں پر مادۂ منویہ کی ذخیرہ اندوزی کا پہلا مرکز (Sperm Bank) قائم ہوا۔ ۱۹۷۸ء میں انگلینڈ میں، بیرون رحم ٹیسٹ ٹیوب میں مخلوط نطفہ کی بارآوری (In Vitro Fertilization) کا کامیاب تجربہ کیا گیا، اس کے نتیجے میں پہلی ٹیسٹ ٹیوب بے بی پیدا ہوئی۔ ۱۹۸۵ء میں امریکا میں قائم مقام مادریت کا پہلا کامیاب تجربہ کیا گیا۔ ایک عورت نے اپنا بیضہ اور رحم دونوں اس کام کے لیے پیش کیے۔ ایک مرد کے نطفے سے اس کے بیضے کو مخلوط کر کے اسی کے رحم میں استقرار حمل کا کام انجام پایا۔ اگلے سال اس سے ایک بچی پیدا ہوئی، جسے Baby M کا نام دیا گیا۔ پھر تو پوری دنیا میں اس تکنیک کو اختیار کیا جانے لگا۔ ابتدا میں اولاد چاہنے والے جوڑوں اور جنین کی پرورش کے لیے اپنا رحم پیش کرنے والی عورتوں کے درمیان کچھ تنازعات سامنے آئے، کہ وہ عورتیں وضع حمل کے بعد مادرانہ جذبات سے مغلوب ہو کر بچے حوالے کرنے سے انکار کر دیتی تھیں، لیکن بہت جلد عدالتی چارہ جوئی اور قوانین کی تشکیل کے ذریعے ان مسائل پر قابو پا لیا گیا۔

رحمِ مادر کی کرایہ داری کی دو صورتیں ہیں، ایک صورت ہم دردانہ (Altruistic) یا رضا کارانہ (Voluntary) ہے، جس میں عورت اپنی خدمت کے عوض کوئی رقم نہیں لیتی، اور دوسری تجارتی (Commercial) ہے، جس میں وہ بھاری معاوضہ وصول کرتی ہے۔ بعض ممالک میں اس تکنیک سے صرف رضا کارانہ طور پر فائدہ اٹھانے کی اجازت ہے، اس خدمت

کا کوئی معاوضہ وصول کرنا ممنوع ہے، جب کہ بیش تر ممالک میں قانونی طور پر دونوں صورتوں کی اجازت ہے۔ مغرب میں اس چیز نے ایک منافع بخش کاروبار کی شکل اختیار کرلی ہے، جو عورتیں اس خدمت کے لیے اپنے آپ کو پیش کرتی ہیں وہ اس پر خطیر رقم طلب کرتی ہیں۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ امریکا میں اس تکنیک سے بچہ حاصل کرنے پر اسّی (۸۰) ہزار سے ایک لاکھ امریکی ڈالر کا صرفہ آتا ہے۔

ہندوستان میں اجرت پر رحمِ مادر کا حصول

عالمی سطح پر رحمِ مادر کی کرایہ داری کے معاملے میں ہندوستان سرِ فہرست ہے۔ اس کی دو وجہیں ہیں: ایک یہ کہ اس تکنیک کو اختیار کرنے پر ترقی یافتہ ممالک میں جو صرفہ آتا ہے، ہندوستان میں اس کی ایک تہائی رقم سے کام چل جاتا ہے۔ دوسری وجہ یہ کہ یہاں غربت کے مارے افراد کو اس خدمت کے لیے خود کو پیش کرنے پر خاطر خواہ رقم مل جاتی ہے، جسے وہ اپنے لیے نعمتِ غیر مترقبہ سمجھتے ہیں۔ ہندوستان میں ۲۰۰۲ء سے رحم کی کرایہ داری کی قانونی طور پر اجازت ہے۔ ابتدا میں یہ اجازت صرف رضا کارانہ طور پر تھی، معاوضہ حاصل کرنا ممنوع تھا۔ ۲۰۰۸ء میں سپریم کورٹ نے اپنے ایک فیصلے کے ذریعے اس کی بھی اجازت دے دی۔ اس کے نتیجے میں مغربی ممالک سے تعلق رکھنے والے اولاد کے خواہش مند افراد بڑے پیمانے پر ہندوستان کا رخ کرنے لگے۔ ان ممالک میں امریکا، برطانیہ، کینیڈا، تائیوان، فرانس اور آسٹریلیا خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ایک طرف ان لوگوں کو یہ فائدہ ہوا کہ انھیں کم خرچ پر یہ سہولت حاصل ہوگئی۔ کہاں تو ان ممالک میں اس پر ایک لاکھ ڈالر کا صرفہ آتا تھا اور کہاں ہندوستان میں ۱۵ سے ۲۰ ہزار ڈالر میں کام چلنے لگا۔ دوسری طرف ہندوستانی بھی اس منافع بخش کاروبار سے مالا مال ہونے لگے۔ ایک غریب یا اوسط درجے کا ہندوستانی دس سال میں جتنا کچھ کما پاتا ہے، اس کی بیوی ایک بار نو ماہ کے لیے اپنے رحم کو کرایے پر دے کر اتنی رقم حاصل کرلیتی ہے۔ اس چیز نے ہندوستان میں ایک انڈسٹری کی شکل اختیار کرلی ہے، جسے Fertility Tourism Industry کا نام دیا گیا ہے۔ اس کا شمار بہت تیزی سے ترقی کرنے

والی انڈسٹریز میں ہونے لگا ہے۔ ۲۰۱۱ء کے ایک سروے کے مطابق اس انڈسٹری میں بیس (۲۰) بلین روپے کا سرمایہ لگا ہوا تھا۔ اس صورتِ حال نے ہندوستان کو Surrogacy Capital of the world کا درجہ دے دیا ہے۔

دوسری عورت کا رحم اجرت پر لینے کے اسباب

بچے کے لیے دوسری عورت کی خدمات حاصل کرنے اور اس کا رحم اجرت پر لینے کے متعدد اسباب ہیں:

۱- اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہوتا ہے کہ کسی مرض کی وجہ سے عورت کا رحم نکال دیا گیا ہو، مثلاً اس میں کینسر ہو، یا اس سے مسلسل جریانِ خون ہو رہا ہو اور کسی بھی طریقے سے وہ رک نہ رہا ہو، یا اس میں رسولی (Tumour) ہو۔

۲- عورت کسی ایسے مرض میں مبتلا ہو، جس مرض کے، اس کے رحم میں استقرار حمل کی صورت میں، جنین میں منتقل ہو جانے کا اندیشہ ہو، مثلاً ایڈز۔

۳- عورت کے رحم میں جنین کی پرورش وضع حمل تک صحیح طریقے سے نہ ہو پاتی ہو، جنین بار بار رحم میں مرجاتا ہو یا اس کا اسقاط ہو جاتا ہو۔

۴- عورت کی عمر زیادہ ہوگئی ہو، جس کی بنا پر اس کے رحم میں استقرار حمل ممکن نہ ہو۔

۵- اپنی جسمانی ساخت اور حسن کی حفاظت یا عیش وعشرت کے لیے بعض عورتیں حمل ووضع حمل کے بکھیڑوں میں نہیں پڑنا چاہتیں، اس لیے وہ اس تکنیک سے فائدہ اٹھاتی ہیں۔

۶- مغرب میں غیر شادی شدہ مرد یا عورتیں (Single Parents) اس تکنیک کے ذریعے اپنا حیاتیاتی (Biological) بچہ حاصل کرتی ہیں۔

۷- ہم جنس پرست افراد (Same Sex Couple) بھی بچہ حاصل کرنے کے لیے اس تکنیک کو استعمال کرتے ہیں۔

قائم مقام مادریت کی صورتیں

قائم مقام مادریت کی بنیادی طور پر چار صورتیں ہوسکتی ہیں:

۱- شوہر نطفہ اور بیوی بیضہ فراہم کرسکتی ہو، لیکن بیوی رحم کے کسی مرض کی وجہ سے حاملہ نہیں ہوسکتی یا ہونا نہیں چاہتی، لہٰذا زوجین کسی دوسری عورت کے رحم کو کرایے پر لے لیتے ہیں۔ ٹیسٹ ٹیوب میں دونوں کے مادوں کا ملاپ کر کے حاصل شدہ جنین کو اس عورت کے رحم میں منتقل کر دیا جاتا ہے اور ولادت کے بعد اس بچے کو زوجین کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ اسے Traditional Surrogacy کہا جاتا ہے۔

۲- بیوی سے بیضہ بھی حاصل نہیں ہوسکتا۔ شادی شدہ جوڑا اولاد کے لیے کسی دوسری عورت کی خدمات حاصل کرتا ہے، تاکہ شوہر کا نطفہ اس (دوسری عورت) کے بیضہ سے مل کر بہ صورت جنین اس کے رحم میں پرورش پائے۔ اسے Geostational Surrogacy کا نام دیا گیا ہے۔

۳- نہ نطفہ شوہر کا ہو نہ بیضہ بیوی کا۔ نطفہ کسی دوسرے مرد کا اور بیضہ کسی دوسری عورت کا حاصل کیا جائے اور ان کی بارآوری کسی اور عورت کے رحم میں، جسے کرایہ پر حاصل کیا گیا ہو، کی جائے۔ اس کام کے لیے مغرب میں بڑے بڑے کمرشیل اسپرم بینک قائم ہوگئے ہیں۔ ابھی چند ماہ پہلے خبر آئی تھی کہ ہندوستان میں بھی اس طرز کا بینک قائم ہوگیا ہے۔

۴- بیضہ بیوی کا ہو، لیکن نطفہ شوہر کا نہ ہو۔ اسپرم بینک سے اپنی پسند کا کوئی نطفہ حاصل کر کے اور اسے بیضہ سے بارآور کرا کے استقرارِ حمل کسی دوسری عورت کے رحم میں کروایا جائے۔ یہ صورت اس وقت اختیار کی جاتی ہے جب شوہر نامرد ہو اور بیوی کا رحم استقرارِ حمل کے قابل نہ ہو، البتہ اس کا بیضہ صحیح سالم ہو۔

اخلاقی اور تہذیبی جواز؟

ربع صدی سے زائد عرصہ گزر جانے کے باوجود یہ مسئلہ عالمی سطح پر ماہرینِ سماجیات کے درمیان اب تک بحث و گفتگو کا موضوع نہیں بن سکا ہے۔ اور اس کے اخلاقی، سماجی اور تہذیبی مضمرات کا ٹھیک سے جائزہ نہیں لیا گیا ہے۔ اسے صرف اس پہلو سے دیکھا گیا ہے کہ جو جوڑے فطری طریقۂ تولید کے ذریعے اولاد نہیں حاصل کر سکتے یا جو افراد رشتۂ ازدواج میں

بندھے بغیر اولاد چاہتے ہیں، اس تکنیک کے ذریعے انہیں اپنی خواہش پوری کرنے کا زرّیں موقع ہاتھ آ گیا ہے، لیکن اس کام کے لیے جو عورت اپنا رحم پیش کرتی ہے وہ اس کے عوض چند ٹکے تو پا جاتی ہے، لیکن اپنے رحم میں پرورش پانے والے جنین کو دوسرے شخص کے حوالے کرنے کے جو نفسیاتی اثرات اس پر پڑتے ہیں اس کا تجزیہ کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ اس معاملے میں زیادہ سے زیادہ، غریب عورتوں کے استحصال کے امکان کے پیش نظر تفصیلی قوانین وضع کیے جانے کا مطالبہ کیا گیا ہے، اور بعض ممالک میں ایسے قوانین منظور بھی ہو گئے ہیں۔ لیکن اس مسئلے پر اس سے زیادہ توجہ دینے اور اس کے مختلف پہلوؤں پر بحث و مذاکرہ کی ضرورت ہے۔

آئندہ سطور میں اس موضوع پر بحث کی جائے گی کہ اسلام اس پورے معاملہ کو کس نظر سے دیکھتا ہے؟ اور اس کے سلسلے میں اس کا کیا موقف ہے؟

اسلام کی بنیادی تعلیمات

قبل اس کے کہ اس موضوع پر اسلام کے موقف کی بہ راہ راست وضاحت کی جائے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے عائلی نظام سے متعلق چند بنیادی تعلیمات بیان کر دی جائیں۔

(الف) نکاح-توالد وتناسل کا واحد جائز ذریعہ

اسلام نے توالد وتناسل کو رشتۂ ازدواج سے منسلک کیا ہے۔ اس کے نزدیک نسل انسانی میں اضافہ کا فطری طریقہ یہ ہے کہ مردوں اور عورتوں کے درمیان باہم نکاح ہو اور جائز اور قانونی طریقہ سے ان کے درمیان جنسی تعلق قائم ہو، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَـٰٓأَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا۟ رَبَّكُمُ الَّذِى خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً۔ (النساء:۱)

لوگو اپنے رب سے ڈرو، جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورت دنیا میں پھیلا دیے۔

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجاً وَّجَعَلَ لَكُم مِّنْ أَزْوَاجِكُم بَنِيْنَ وَحَفَدَةً وَرَزَقَكُم مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۔(النحل:۷۲)

اور وہ اللہ ہی ہے جس نے تمھارے لیے تمھاری ہم جنس بیویاں بنائیں اور اسی نے ان بیویوں سے تمھیں بیٹے پوتے عطا کیے اور اچھی اچھی چیزیں تمھیں کھانے کو دیں۔

ناجائز جنسی تعلق کو اسلام میں سراسر حرام قرار دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلاَ تَقْرَبُواْ الزِّنٰٓى إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَسَآءَ سَبِيْلاً (بنی اسرائیل:۳۲)

زنا کے قریب نہ پھٹکو، وہ بہت برا فعل ہے اور بڑا ہی برا راستہ۔

(ب) مرد کے نطفے سے کسی غیر عورت کو بارآور نہیں کیا جاسکتا

اسلامی شریعت کی رُو سے یہ قطعاً ناجائز ہے کہ کسی مرد کے نطفے سے ایسی عورت کو بارآور کیا جائے جو اس سے رشتۂ ازدواج میں منسلک نہ ہو۔ حضرت رویفع بن ثابتؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

لایحل لامرئ یومن باللہ والیوم الآخر ان یسقی ماؤہ زرع غیرہ[۱]

کسی شخص کے لیے، جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتا ہو، جائز نہیں ہے کہ اپنے پانی (یعنی مادۂ تولید) سے کسی دوسرے کی کھیتی کو سیراب کرے (یعنی غیر عورت سے مباشرت کرے)۔

اس حدیث میں اصلاً 'استبراءِ رحم' کا حکم بیان ہوا ہے، یعنی اگر کوئی عورت کسی مرد سے حاملہ ہو، تو اس کے وضعِ حمل سے قبل کسی دوسرے مرد کے لیے اس سے مباشرت کرنا جائز نہیں ہے۔ راویٔ حدیث حضرت رویفعؓ نے 'ای اتیان الحبالیٰ' کے الفاظ سے یہی تشریح کی ہے، لیکن اس حدیث کا عام مفہوم بھی لیا جاسکتا ہے کہ کسی مرد کے لیے اپنا نطفہ کسی اجنبی عورت کے رحم میں داخل کرنا جائز نہیں ہے۔ مولانا شمس الحق عظیم آبادیؒ نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے:

---

[۱] سنن ابی داؤد، کتاب النکاح، باب فی وطی السبایا، ۲۱۵۸

ای یدخل نطفته محل زرع غیرہ۔[۱] یعنی (کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ) اپنا نطفہ ایسی جگہ داخل کرے جہاں دوسرے کے بچے کی پرورش ہوتی ہے۔

(ج) شرم گاہ کی حفاظت

اسلام نے مردوں اور عورتوں دونوں پر لازم کیا ہے کہ وہ اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قُل لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوا مِنْ أَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوا فُرُوجَهُمْ ... وَقُل لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوجَهُنَّ۔ (النور:۳۰-۳۱)

(اے نبی) مومن مردوں سے کہو کہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں ... اور (اے نبی) مومن عورتوں سے کہہ دو کہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں۔

دوسری آیت میں یہی بات کھول دی گئی ہے کہ ممانعت اصلاً ناجائز جنسی تعلق کی ہے، چنانچہ اہل ایمان کا ایک وصف یہ بھی بیان کیا گیا ہے:

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ. إِلَّا عَلَى أَزْوَاجِهِمْ ...۔ (المومنون:۵-۶)

اور جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، سوائے اپنی بیویوں کے ...۔

'شرم گاہوں کی حفاظت' میں جہاں یہ بات شامل ہے کہ ماورائے نکاح کسی طرح کا جنسی تعلق قائم نہ کیا جائے، وہیں اس کا اطلاق اس پر بھی ہوتا ہے کہ جنسی اعضاء سے کوئی ایسا کام نہ لیا جائے جو فطری طریقۂ تولید کے مغایر ہو۔ اسی بنا پر لواطت (Homosexulity) استمناء بالید (Masterbation) اور جنسی تسکین کے دیگر غیر فطری طریقوں کو ناجائز قرار دیا گیا ہے۔[۲]

---

[۱] عون المعبود شرح سنن ابی داؤد، شمس الحق عظیم آبادی، المکتبۃ السلفیہ، مدینہ منورۃ، ۱۹۶۸ء، ۶/۱۹۵

[۲] تفسیر القرآن العظیم، ابن کثیر، دار ابن حزم بیروت، ۱۴۲۰ھ/۲۰۰۰ء، ص ۱۲۹۱

(د) نسب کی حفاظت ضروری ہے

اولاد کی خواہش انسان کی فطری خواہش ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِيْنَ...(آل عمران:۱۴) — لوگوں کے لیے مرغوبات نفس: عورتیں، اولاد ... بڑی خوش آیند بنادی گئی ہیں۔

اگر کسی وجہ سے کسی شادی شدہ جوڑے کی یہ خواہش پوری نہ ہوسکے تو اسلام اجازت دیتا ہے کہ وہ کسی رشتہ دار یا یتیم بچے کو اپنا کر اس کی پرورش کر سکتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی وہ نسب کی حفاظت پر بہت زور دیتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ جائز نہیں کہ کوئی شخص اپنے باپ کے علاوہ کسی دوسرے کو اپنا باپ کہے یا کوئی شخص کسی دوسرے کی اولاد کو اپنی اولاد قرار دے۔ احادیث میں ایسا کرنے سے سختی سے منع کیا گیا ہے اور اس پر وعید سنائی گئی ہے۔

حضرت واثلہ بن اسقعؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

ان من اعظم الفِرَی ان یدّعی الرجل الیٰ غیر ابیه [۱] — سب سے بڑا بہتان یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے باپ کے علاوہ کسی اور کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرے۔

حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

لیس من رجل ادّعی لغیر ابیه وهو یعلمه الا کفر [۲] — جس شخص نے جان بوجھ کر اپنی نسبت اپنے باپ کے علاوہ کسی اور شخص کی طرف کی اس نے کفر کیا۔

عہد جاہلیت میں کوئی شخص کسی دوسرے کے بچے کو اپنا بیٹا بنا لیتا تھا تو وہ اسی کی طرف منسوب ہوجاتا تھا اور اس کا تعارف اس کے بیٹے کی حیثیت سے ہونے لگتا تھا۔ اس سے روک دیا گیا اور یہ آیت نازل ہوئی:

---

[۱] صحیح بخاری، کتاب المناقب، ۳۵۰۹

[۲] صحیح بخاری: ۳۵۰۸

وَمَا جَعَلَ أَدْعِيَاءَكُمْ أَبْنَاءَكُمْ ذَلِكُمْ قَوْلُكُم بِأَفْوَاهِكُمْ وَاللَّهُ يَقُولُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيلَ. ادْعُوهُمْ لِآبَائِهِمْ هُوَ أَقْسَطُ عِندَ اللَّهِ فَإِن لَّمْ تَعْلَمُوا آبَاءَهُمْ فَإِخْوَانُكُمْ فِي الدِّينِ وَمَوَالِيكُمْ۔

(الاحزاب:۴-۵)

اور نہ اس نے تمھارے منہ بولے بیٹوں کو تمھارا حقیقی بیٹا بنایا ہے۔ یہ تو وہ باتیں ہیں جو تم لوگ اپنے منہ سے نکال دیتے ہو، مگر اللہ وہ بات کہتا ہے جو مبنی برحقیقت ہے اور وہی صحیح طریقے کی طرف رہ نمائی کرتا ہے۔ منہ بولے بیٹوں کو ان کے باپوں کی نسبت سے پکارو، یہ اللہ کے نزدیک زیادہ منصفانہ بات ہے۔ اور اگر تمھیں معلوم نہ ہو کہ ان کے باپ کون ہیں تو وہ تمھارے دینی بھائی اور رفیق ہیں۔

علامہ قرطبیؒ نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے:

''اس آیت کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے 'تبنّی' (کسی کو منہ بولا بیٹا بنانا) کا حکم اٹھالیا اور کسی شخص کو جو حقیقی بیٹا نہ ہو، بیٹا کہنے سے روک دیا اور اس بات کی طرف رہ نمائی کی کہ زیادہ بہتر اور مبنی برانصاف رویّہ یہ ہے کہ آدمی کو اس کے نسبی باپ کی طرف منسوب کیا جائے۔''[۱]

رحم کی کرایہ داری - اسلام کا نقطۂ نظر

رحم کی کرایہ داری کی جو صورتیں رائج ہیں اور جن کا گزشتہ سطور میں تذکرہ کیا گیا ہے، ان میں دینی وشرعی اعتبار سے بڑے مفاسد پائے جاتے ہیں:

۱- قرآن میں اہل ایمان مردوں اور عورتوں دونوں کو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کا حکم دیا گیا ہے۔ جو عورت اپنے رحم میں کسی غیر مرد کے بارآور نطفہ کی پرورش کرتی ہے وہ اس حکم کو پامال کرتی ہے۔

۲- اسلام نے توالد وتناسل کو نکاح کے ساتھ مشروط کیا ہے۔ اس تکنیک کے ذریعے جو عورت اپنے رحم میں کسی مرد کے نطفے کا استقرار کرواتی ہے، اس سے اس کا ازدواجی رشتہ نہیں ہوتا۔

---

[۱] الجامع لاحکام القرآن، قرطبی، دارالکتب العلمیہ بیروت، ۱۹۸۸ء، جلد: ۷، جزء: ۱۴، ص: ۸۰

۳- اسلام نے نسب کی حفاظت پر بہت زور دیا ہے، جب کہ اس تکنیک کو اختیار کرنے سے اختلاطِ نسب کا قوی شبہ پیدا ہو جاتا ہے۔

۴- انسان کا جسم اور اس کے اعضاء اس کے پاس اللہ تعالیٰ کی امانت ہیں۔ انھیں نہ فروخت کیا جا سکتا ہے نہ کرایہ پر اٹھایا جا سکتا ہے۔

۵- جو عورت اس خدمت کے لیے اپنے آپ کو پیش کرتی ہے وہ اگر بے شوہر کی ہے (کہ غیر شادی شدہ یا مطلقہ یا بیوہ ہے) تو سماج میں اس پر بدکاری اور دیگر ناپسندیدہ الزامات لگنے کا قوی اندیشہ ہوتا ہے۔

ان مفاسد کی وجہ سے تمام علماء نے متفقہ طور پر قائم مقام مادریت کی مذکورہ بالا تمام صورتوں کو حرام قرار دیا ہے۔ یہ موضوع بین الاقوامی فقہ اکیڈمیوں میں بھی زیر بحث رہا ہے اور ان میں بھی ان کی حرمت پر علماء کا اتفاق رہا ہے۔ ان اجلاسوں کی تفصیل درج ذیل ہے:

- رابطہ عالم اسلامی کی زیر نگرانی قائم اسلامک فقہ اکیڈمی مکہ مکرمہ کا آٹھواں اجلاس، منعقدہ ۲۸/ ربیع الثانی تا ۷/ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۵ھ (۱۹۸۵ء)۔
- تنظیم اسلامی کانفرنس کی زیر نگرانی قائم بین الاقوامی اسلامی فقہ اکیڈمی جدہ کا تیسرا اجلاس منعقدہ عمان مورخہ ۸ تا ۱۳/ صفر ۱۴۰۷ھ (۱۹۸۶ء)
- مصر کی مجمع البحوث الاسلامیۃ کا اجلاس قاہرہ، ۲۰۰۱ء

عالم اسلام کے مشہور فقہاء: ڈاکٹر جاد الحق علی جاد الحق (سابق شیخ الازہر مصر)، ڈاکٹر محمد سید طنطاوی (شیخ الازہر)، ڈاکٹر یوسف القرضاوی (قطر)، ڈاکٹر مصطفیٰ زرقاء، رکن اسلامک فقہ اکیڈمی مکہ مکرمہ وغیرہ نے بھی رحم کی کرایہ داری کی مذکورہ بالا تمام صورتوں کو حرام قرار دیا ہے۔[۱]

قائم مقام مادریت کی ایک جائز صورت

ایک صورت یہ ہے کہ ایک شخص کی دو بیویاں ہوں۔ ایک بیوی میں بیضہ

---

[۱] مقالہ: تاجیر الارحام فی الفقہ الاسلامی، د. ھند الخولی، مجلۃ جامعۃ دمشق للعلوم الاقتصادیۃ والقانونیۃ، جلد ۲۷، شمارہ ۳، ۲۰۱۱ء، ص ۲۸۲-۲۸۳

(Ovum) تو بنتا ہو، لیکن وہ رحم (Uterus) کے کسی ایسے مرض میں مبتلا ہو کہ اس میں حمل کا استقرار نہ ہوسکتا ہو، اس کا بیضہ لے کر شوہر کے نطفے (Sperm) سے اسے بارآور (Fertilize) کیا جائے، پھر اس کی پرورش دوسری بیوی کے رحم میں ہو۔ کیا اسلامی شریعت اس کی اجازت دیتی ہے؟

تنظیم اسلامی کانفرنس کی زیرنگرانی قائم بین الاقوامی اسلامی فقہ اکیڈمی جدہ کے اجلاس عمان ۱۴۰۷ھ (۱۹۸۶ء) میں اس صورت کو بھی ناجائز قرار دیا گیا ہے۔ رابطہ عالم اسلامی کی زیرنگرانی قائم اسلامی فقہ اکیڈمی کے اجلاس مکہ مکرمہ ۱۴۰۴ھ (۱۹۸۴ء) کے شرکاء نے اس صورت کو جائز قرار دیا تھا، لیکن اگلے اجلاس ۱۴۰۵ھ (۱۹۸۵ء) میں اس فیصلے کو واپس لے لیا گیا اور اس صورت کو بھی حرام قرار دے دیا گیا۔ اس کی دلیل یہ دی گئی کہ اس سے اختلاطِ نسب کا شبہ پیدا ہوتا ہے۔ البتہ ہندوستانی فقہاء اس صورت کے جواز کا رجحان رکھتے ہیں۔ مولانا محمد برہان الدین سنبھلی نے لکھا ہے:

> ''بیضہ جس عورت سے لیا گیا اگر وہ بھی بیوی ہو اس مرد کی، جس کے نطفہ سے مخلوط کیا گیا ہے اور پھر یہ مرکب جس عورت کے جسم میں داخل کیا گیا ہے وہ بھی اس مرد کی بیوی ہو تو جواز کا امکان ہے، ورنہ نہیں'' ۔[۱]

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے جواز کی ایک صورت یہ بتائی ہے:

> ''شوہر اور اس کی ایک بیوی کا مادہ حاصل کیا جائے اور اس کے آمیزے کو اسی شوہر کی دوسری بیوی کے رحم میں منتقل کر دیا جائے۔ اس لیے کہ اس کی پہلی بیوی زچگی کی متحمل نہ ہو، یا طبّی اسباب کی بنا پر تولید کی اہل نہ ہو'' ۔[۲]

ایک شاذ رائے

اجرت پر رحم مادر کے حصول کی درج بالا صورتوں میں سے پہلی صورت کو بعض علماء نے جائز قرار دیا ہے۔ وہ یہ کہ شوہر نطفہ اور بیوی بیضہ فراہم کرسکتی ہو، لیکن اس کے رحم میں کسی

---

[۱] موجودہ زمانے کے مسائل کا شرعی حل، مولانا برہان الدین سنبھلی، طبع دہلی، ۱۹۹۲ء، ص ۱۸۲

[۲] حلال وحرام، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد، ۱۹۹۳ء، ص ۳۰۳

مرض کی وجہ سے بارآور نطفہ کا اس میں استقرار نہ ہوسکتا ہو۔ چنانچہ دونوں کے مادوں کو ٹیسٹ ٹیوب میں بارآور کر کے کسی دوسری عورت کے رحم میں منتقل کر دیا جائے اور وہ جنین کی پرورش کر کے ولادت کے بعد بچے کو زوجین کے حوالے کر دے۔ ڈاکٹر عبدالمعطی بیومی، رکن مجمع البحوث الاسلامیہ وسابق پرنسپل کلیۃ اصول الدین جامعۃ الازہر (مصر) کی رائے میں یہ صورت جائز ہے۔ انھوں نے اسے 'رضاع' کے مسئلے پر قیاس کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جس طرح شریعت نے بچے کو ماں کے علاوہ کسی دوسری عورت کے لیے دودھ پلانا جائز قرار دیا ہے، بچہ اس کے دودھ سے تغذیہ حاصل کرتا اور پرورش پاتا ہے۔ اسی طرح جنین کی تشکیل اصلاً شوہر کے نطفہ اور بیوی کے بیضہ سے ہوجاتی ہے۔ کسی دوسری عورت کا رحم اس کو صرف غذا فراہم کرتا ہے۔ اس لیے اگر کچھ احتیاطی تدابیر اختیار کی جائیں، مثلاً یہ کہ اپنا رحم پیش کرنے والی عورت اگر شادی شدہ ہو تو اس زمانے میں اس کا شوہر اس سے مباشرت نہ کرے، تاکہ اختلاط نسب کا خدشہ نہ پایا جائے تو اس صورت کو جائز قرار دیا جاسکتا ہے۔[۱]

یہ ایک کم زور رائے ہے۔ اجنبی عورت کے رحم میں جنین کی پرورش کو مسئلہ رضاع پر قیاس کرنا درست نہیں ہے۔ رضاع کی اجازت شریعت میں ایک زندہ وجود (بچے) کی زندگی کی حفاظت وبقا کے لیے دی گئی ہے، جب کہ اجنبی عورت کے رحم کو اجرت پر حاصل کر کے ایک نئی زندگی کو وجود میں لانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ رضاع کی صورت میں اختلاط نسب کا کوئی امکان نہیں ہوتا، جب کہ موخر الذکر صورت میں اختلاطِ نسب کا قوی اندیشہ ہوتا ہے۔ اسی بنا پر اس رائے کو علماء کے درمیان مقبولیت نہیں حاصل ہوئی ہے۔

اجرت پر رحم مادر کے حصول کا معاملہ موجودہ دور کے نئے مسائل میں سے ہے، گو یہ پوری دنیا میں بڑے پیمانے پر رواج پا رہا ہے، لیکن اس میں چوں کہ اسلام کے عائلی نظام سے متعلق متعدد مفاسد پائے جاتے ہیں، اس لیے شرعی اعتبار سے اس کی کوئی صورت اختیار کرنا جائز نہیں ہے۔

☆☆☆

---

[۱] مقالہ تاجیر الارحام، حوالہ سابق

ادارۂ تحقیق و تصنیفِ اسلامی کی

چند اردو مطبوعات

	کتاب	مصنف	صفحات	قیمت
۱	معرکۂ اسلام و جاہلیت	مولانا صدرالدین اصلاحی	۱۳۷	۹۰
۲	مذہب کا اسلامی تصور	مولانا سلطان احمد اصلاحی	۵۹۱	۱۰۰
۳	مشترکہ خاندانی نظام اور نظریہ اسلام	مولانا سلطان احمد اصلاحی	۱۰۲	۴۰
۴	وحدتِ ادیان کا نظریہ اور اسلام	مولانا سلطان احمد اصلاحی	۱۹۲	۴۰
۵	آزادیٔ فکر ونظر اور اسلام	مولانا سلطان احمد اصلاحی	۱۲۸	۴۰
۶	قرآن، اہلِ کتاب اور مسلمان	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	۲۹۶	۷۰
۷	حضرت ابراہیم علیہ السلام	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	۲۰۰	۵۰
۸	اہلِ مذاہب کو قرآن کی دعوت	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	۸۴	۴۵
۹	کفر اور کافر قرآن کی روشنی میں	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	۶۰	۲۰
۱۰	جرائم اور اسلام	مولانا محمد جرجیس کریمی	۲۲۴	۵۰
۱۱	مسلمانوں کی حقیقی تصویر	مولانا محمد جرجیس کریمی	۱۶۴	۵۵
۱۲	عہدِ نبوی کا نظامِ حکومت	پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی	۱۳۶	۳۰
۱۳	شیئر بازار میں سرمایہ کاری	ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی		

ملنے کے پتے

ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، پوسٹ بکس نمبر-۹۳، علی گڑھ-۱

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلیشرز، دعوت نگر ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی- ۲۵

تحقیق وتنقید

اسلام کا نظامِ تکافل

مولانا اختر امام عادل قاسمی

اسلام ایک ہمہ گیر اور مستقل نظام حیات کا نام ہے۔ اس کے پاس زندگی کے ہر مرحلے کے لیے مکمل، اطمینان بخش اور قابل عمل ہدایات موجود ہیں۔ اس کو اپنی رہ نمائی کے لیے کسی دوسرے نظام حیات سے مدد لینے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ صدیوں کا مشاہدہ اور تجربہ یہ ہے کہ ہر دور میں انسانوں کے دیگر خود ساختہ نظاموں نے اپنے استحکام اور معنویت کے لیے اسلامی اصول وکلیات کا سہارا لیا ہے۔

انشورنس کی تاریخ

گزشتہ چند دہائیوں سے انشورنس کا مسئلہ کافی حساس نوعیت کا حامل ہوگیا ہے اور کسی بھی نظام اجتماع کے لیے اس کی بے حد ضرورت محسوس کی جارہی ہے۔ اگر چہ اس کی تاریخ بہت قدیم ہے، بعض تاریخی روایات سے پتہ چلتا ہے کہ ۹۱۶ قبل مسیح ہی میں اس کو باقاعدہ سسٹم کی صورت حاصل ہوگئی تھی، اور بحری سفر میں اس نظام سے استفادہ کیا جاتا تھا۔ قدیم روما کی تاریخ میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے۔ کہتے ہیں کہ چین میں اس کی تاریخ پانچ ہزار (۵۰۰۰) سال قدیم ہے۔ عرب کی تاریخ جاہلی میں تجارتی اسفار کے ضمن میں ابن خلدون نے اس کا تذکرہ کیا ہے کہ قافلہ میں کسی ساتھی کا اونٹ ہلاک ہوجاتا یا کسی کو غیر متوقع شدید تجارتی نقصان درپیش آتا تو دوسرے ساتھی نقصان کی تلافی کے پابند ہوتے تھے۔ اس طرح باہمی تعاون سے ان کا کاروبار چلتا تھا۔[۱]

علامہ شامیؒ نے بھی 'مستامن' کی بحث کے ذیل میں 'سوکرہ' کے نام سے اس کا ذکر کیا ہے۔[۲]

انشورنس کی ابتدائی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا آغاز تعاون باہم کے جذبہ سے ہوا تھا۔ بعد میں اس کو منفعت بخش تجارت میں تبدیل کر دیا گیا۔ اسی لیے ابتدائی دور میں یہ ایک سادہ قسم کی چیز اور ہر طرح کی خرابیوں سے پاک تھی۔ بعد کے ادوار میں جب اس پاک جذبہ کا استحصال شروع ہوا اور یہودی لابی کی کوششوں سے اس کو زیادہ سے زیادہ مال کمانے کا ذریعہ بنالیا گیا تو اس میں ربا، قمار، ظلم اور فریب کے عناصر بھی شامل ہوتے گئے۔ جب تک یہ سادہ حالت میں تھا اس وقت تک موضوع بحث نہیں تھا، ناجائز عناصر کی شمولیت کے بعد یہ موضوع بحث بن گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر آج بھی بیمہ کو اس کی اصل حالت میں واپس لایا جائے اور اسے فاسد عناصر سے پاک کر دیا جائے تو ساری بحث ختم ہوجائے گی اور وہ ہر شخص کے لیے قابل قبول ہوگا۔

اسلامی تعلیمات میں تکافل کی بنیادیں

آج عالمی طور پر اس کی ضرورت محسوس کی جارہی ہے کہ ان بنیادوں کو دریافت کیا جائے جن پر اسلامی انشورنس کی تشکیل کی جاسکے اور ایک بہتر نظامِ تکافل کی تعمیر ہو سکے۔ اس لیے کہ ایک ترقی یافتہ معاشرہ کے لیے اس کی بہت اہمیت ہے ۔

اسلامی تعلیمات میں تکافل کی درج ذیل بنیادیں موجود ہیں:

(الف) تعاونِ باہم

اسلام تعاونِ باہم اور تبرّع وایثار کا سب سے بڑا وکیل ہے۔ قرآن وحدیث کی بے شمار نصوص میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون، ایثار اور محبت وخلوص کی تلقین کی گئی ہے، مثلاً:

وَيَسْـَٔلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ (البقرۃ:۲۱۹)	لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟ آپ فرمادیں کہ عفو (یعنی ضرورت سے زائد مال خرچ کردو۔)
وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ. (التوبۃ:۳۴)	جولوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں صرف نہیں کرتے، ان کو دردناک عذاب کی بشارت سناویں۔

احادیث میں بھی دوسروں پر خرچ کرنے اور ان کی ضرورتوں میں کام آنے کی تلقین کی گئی ہے۔ ایک موقعہ پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

من کانت لہٗ فضل ارض فلیزرعھا او لیمنحھا اخاہ فان ابیٰ فلیمسک ارضہ۔[۳]	جس کے پاس زائد زمین ہو وہ کاشت کرے یا اپنے بھائی کو دے دے۔ اگر اس کی خلاف ورزی کرے تو اس کی زمین روک لی جائے۔

ارشاد نبوی ہے:

من کان معہٗ فضل ظھر فلیعد بہٖ علیٰ من لاظھر لہٗ ومن کان لہٗ فضل زاد فلیعد بہٖ علیٰ من لازاد لہٗ۔[۴]	جس کے پاس زائد سواری ہو وہ اسے اس کو دے دے جس کے پاس سواری نہ ہو اور جس کے پاس زائد کھانا ہو وہ اس کو اس کے حوالہ کردے جس کے پاس کھانا نہ ہو۔

(ب) عام انسانی بنیادوں پر امداد باہم

غریبوں، مسکینوں، یتیموں اور ضرورت مندوں کے شخصی امداد وتعاون پر تو بے شمار نصوص ہیں، لیکن عام انسانی ضرورت کے وقت امداد باہم کے سلسلے کی ہدایات بھی کم نہیں ہیں۔ بطور نمونہ یہاں میثاقِ مدینہ کا تذکرہ کیا جاتا ہے جو ہجرت کے بعد سرکار دوعالم ﷺ کے حکم سے مسلمانوں اور یہودیوں کے لیے تیار کیا گیا تھا:

المھاجرون من قریش علیٰ ربعتھم یتعاقلون بینھم وھم یفدون عانیھم بالمعروف والقسط بین المسلمین۔	مہاجرین قریش اپنی سابقہ حالت پر برقرار رہیں گے اور آپس میں ایک دوسرے کی دیت ادا کریں گے اور اپنے قیدیوں کا فدیہ مسلمانوں کے درمیان معروف طریقے پر حق وانصاف کے ساتھ ادا کریں گے۔
وإن المؤمنین لایترکون مُفْرَحاً بینھم أن یعطوہ بالمعروف فی فداء اوعقل۔	مسلمانوں کو بوجھل اور مایوس نہیں چھوڑا جائے گا بلکہ ان کا فدیہ اور دیت سب مل کر ادا کریں گے۔

وإن المؤمنين المتقين علىٰ من بغىٰ منهم أو ابتغىٰ دسيعة ظلم أو إثم أو عدوان أوفساد بين المؤمنين وأن أيديهم عليه جميعاولو كان ولد أحدهم .

متقی مسلمان باغیوں اور ظالموں کے ظلم وگناہ اور فساد وطغیان کے خلاف مضبوط دیوار ہوں گے، سب کی قوت ایک مانی جائے گی، چاہے ان میں سے کسی کا کوئی بچہ ہی کیوں نہ ہو۔

وإن المؤمنين بعضهم موالى بعض دون الناس .

مسلمان دوسرے لوگوں کے مقابلے میں باہم ایک دوسرے کے مددگار ہوں گے۔

وإنهٗ من تبعنا من يهود فإن لهٗ النصر والاسوة غير مظلومين ولامتناصرين عليهم.

جو یہود ہمارے حمایتی ہوں گے ان کو یکساں طور پر امداد واستحقاق حاصل ہوگا، ان پر کوئی ظلم نہیں ہوگا اور نہ ان کے خلاف کسی کی مدد کی جائے گی۔

وإن كل غازية غزت معنا يعقب بعضهم بعضاً.

جو جماعت ہمارے ساتھ جہاد میں نکلنے کی خواہش مند ہے ان میں باہم ترتیب قائم ہوگی اور وہ یکے بعد دیگرے نکلیں گے۔

وإن المؤمنين يُسِىٔ بعضهم علىٰ بعض بمانال دماء هم فى سبيل الله.

راہ خدا میں شہادت کی صورت میں مسلمان ایک دوسرے کی مکافات برابر طور پر کریں گے۔

وإنهٗ من اعتبط مؤمناً قتلاً عن بينة فإنهٗ قود بهٖ إلاان يرضىٰ وليّ المقتول وإن المؤمنين عليه كافة ولايحل لهم إلا قيام عليه.

جو کسی مؤمن کو بلاقصور قتل کردے اور ثبوت قتل موجود ہو تو اس کا قصاص لیا جائے گا، الّا یہ کہ مقتول کے اولیاء راضی ہوجائیں اور یہ ذمہ داری تمام مسلمانوں پر عائد ہوتی ہے اور ان کے لیے نظام قصاص کے قیام کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔

وإن اليهود ينفقون مع المؤمنين ماداموا محاربين.

جنگی حالات کے دوران یہود مسلمانوں کی مالی امداد جاری رکھیں گے۔

وإن بينهم –بين المسلمين واليهود– النصر علىٰ من حارب أهل هذه الصحيفة.	مسلمان اور یہودی باہم تعاون کے پابند ہوں گے ان لوگوں کے خلاف جو اس میثاق میں شامل فریقوں سے برسر پیکار ہوں۔
وإن بينهم النصح والنصيحة.	ان کے درمیان باہم ہمدردانہ اور خیرخواہانہ جذبات کارفرما رہیں گے۔
وإن بينهم النصر على من دهم يثرب.[۵]	مدینہ منورہ پر یلغار کرنے والوں کے خلاف یہ باہم ایک دوسرے کے تعاون کے پابند ہوں گے۔

غرض اس میثاق میں تعاون باہم اور تکافل اجتماعی کے لیے پورا خاکہ موجود ہے۔ اس میں دیت کی ادائیگی، قیدیوں کی رہائی، قرض یا کمر توڑ اخراجات کے بوجھ سے دبے ہوئے انسانوں کی امداد، ظلم وفساد کے دفعیہ وغیرہ مختلف مشکل مراحل کے لیے اجتماعی تعاون وتکافل کی بنیادیں مہیا کی گئی ہیں۔ اسی سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اس کے لیے مذہب، خطہ، زبان یا پیشہ کسی بھی چیز کو اساس بنایا جاسکتا ہے۔

انشورنس کے مقاصد

انشورنس کے بنیادی مقاصد تین ہیں: (۱) خطرات سے تحفظ اور ذہنی اطمینان (۲) مصیبت کے وقت ایک دوسرے کا تعاون (۳) مستقبل کے لیے احتیاطی تدابیر

شریعت اسلامیہ میں ان تینوں کے لیے پوری گنجائش موجود ہے، بہ شرطے کہ ان میں ناجائز عناصر کی آمیزش نہ ہو۔

تحفظ واطمینان

انسان فطری طور پر امن پسند واقع ہوا ہے۔ ہر شخص کی یہ آرزو رہوتی ہے کہ اسے ایسی جگہ اور ایسا ماحول نصیب ہو جہاں وہ مکمل اطمینان وسکون کے ساتھ رہ سکے، اس کی جان ومال کو کوئی خطرہ نہ ہو اور وہ پوری آزادی اور بے فکری کے ساتھ ترقی کر سکے۔ اسلام نے انسان کی اس فطری خواہش کو رد نہیں کیا، بلکہ قرآن کریم میں اس کا ذکر نعمت خداوندی کے طور پر کیا گیا ہے:

فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هَذَا الْبَيْتِ. الَّذِيْ أَطْعَمَهُم مِّن جُوعٍ وَ آمَنَهُم مِّنْ خَوْفٍ. (قریش:۳-۴)

پس چاہئے کہ لوگ اس گھر کے پروردگار کی عبادت کریں، جس نے ان کو کھانا دے کر بھوک سے اور امن عطا فرما کر خوف سے نجات عطا فرمائی۔

ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

من أصبح منكم معافاً في جسدهٖ آمناً في سربهٖ وعندهٗ قوت يومهٖ فكانماحيزت لهٗ الدنيا. ۶

جس کی صبح اس حال میں ہو کہ وہ جسمانی تکلیف سے آزاد اور نجی زندگی میں پرامن ہو اور اس کے پاس اس دن کی روزی بھی موجود ہو تو گویا اسے ساری دنیا حاصل ہوگئی۔

اسی طرح قرآن کریم کی متعدد نصوص میں بقائے امن اور خطرات سے تحفظ کے لیے احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کی ہدایات دی گئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانفِرُوْا ثُبَاتٍ أَوِ انفِرُوْا جَمِيْعاً۔(النساء:۷۱)

اے ایمان والو! اپنے تحفظ کا سامان اختیار کرو، یا تو سب الگ الگ نکلو یا ایک ساتھ نکلو۔

علاوہ ازیں شریعت اسلامیہ کی بے شمار ہدایات موجود ہیں جن میں ایک محفوظ اور پرامن سوسائٹی کی تشکیل پر زور دیا گیا ہے، جس میں ہر شہری کو اپنے حقوق کے معاملے میں مکمل تحفظ حاصل ہو۔ خلافت الٰہی کی ضرورت اسی لیے ہے۔ خلیفۂ وقت ملک میں اسی نظام کو نافذ کرنے کا پابند ہے، جس میں شریعت کی روشنی میں امن وامان کا ماحول قائم ہو۔ انسانی سوسائٹی اور حیوانی سوسائٹی میں یہی چیز خط امتیاز بنتی ہے۔ اگر انسانی معاشرہ بھی امن وامان اور نجی تحفظات سے محروم ہو تو اس میں اور حیوان میں کیا فرق رہ جائے گا؟!

خطرات سے تحفظ کے لیے تعاون باہم

انسانی زندگی ہر وقت خطرات کے دہانے پر ہے۔ اس سے کوئی فرد مستثنیٰ نہیں ہے۔ اسی لیے اجتماعی زندگی کی بڑی اہمیت ہے۔ خطرات یا نقصانات کا مقابلہ ایک فرد کے لیے مشکل ہے، لیکن یہی بوجھ پوری جماعت پر تقسیم کردیا جائے تو آسان ہوجاتا ہے۔ اسلام نے جائز

مقاصد کے لیے ایک دوسرے کے تعاون کا حکم دیا ہے۔قرآن کریم میں ہے:

وَتَعَاوَنُواْ عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَى وَلاَ تَعَاوَنُواْ عَلَى الإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (المائدۃ:۲) نیکی اور تقویٰ میں ایک دوسرے کی مدد کرو،ظلم وگناہ میں تعاون مت کرو۔

تعاون اپنے وسیع معنیٰ میں اسلامی سوسائٹی کی بنیاد ہے۔اس میں مالی ،بدنی ،اخلاقی ہر قسم کا تعاون داخل ہے۔اسلامی سوسائٹی میں جس طرح مصیبت کے وقت تعاون مطلوب ہے اسی طرح خطرات کی پیش بندی کے لیے بھی تعاون پسندیدہ چیز ہے۔خطرہ فقر وفاقہ کا ہو یا کساد بازاری کا یا تجارتی نقصانات کا، جان کو درپیش ہو یا مال کو، جسمانی صحت متأثر ہوتی ہو یا عزت وآبرو،کسی بھی قسم کا خطرہ ہو،اگر اس کی پیش بندی کے لیے جائز طریقہ اختیار کیا جاتا ہے تو اس میں ایک دوسرے کا تعاون کیا جانا چاہئے ،کہ اس سے فرد کی زندگی اور جماعت کی ترقی وابستہ ہے۔سنت نبوی میں اس کی بہترین مثال موجود ہے۔حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

أن الأ شعريين إذا أرملوا في الغزو أو قل طعام عيالهم بالمدينة جمعوا ما كان عندهم في ثوب واحد ثم اقتسموه بينهم في إناء واحد بالسوية، فهم مني وأنا منهم.[۱]

قبیلۂ اشعر کے لوگ جنگ کے مواقع پر یا مدینہ میں رہتے ہوئے غذائی اشیاء کی کمی محسوس کرتے تو جس کے پاس جو ہوتا اسے لے کر ایک کپڑے میں جمع کر لیتے ،پھر باہم ایک برتن سے برابر برابر تقسیم کر لیتے ،پس وہ مجھ سے ہیں اور میں ان سے ہوں۔

ایک دوسری روایت حضرت سلمہ بن اکوعؓ سے مروی ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ لوگوں کی غذائی اشیاء کم ہوگئیں اور فقر وفاقہ کی نوبت آ پہنچی،تو وہ نبی کریم ﷺ کے پاس اپنے اونٹ ذبح کرنے کی اجازت کے لیے حاضر ہوئے ۔ آپؐ نے اجازت مرحمت فرمادی۔ راستے میں ان لوگوں کی حضرت عمرؓ سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے ان کو ساری روداد سنائی۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ اونٹوں کے بعد پھر تمہاری بقا کا مسئلہ کیا ہوگا؟ پھر حضرت عمرؓ رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اونٹوں کے ختم ہونے کے بعد ان کی زندگی کا کیا ہوگا؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا: لوگوں میں اعلان کرو کہ سب لوگ اپنا بچا ہوا توشہ لے کر حاضر

ہو جائیں۔ پھر چمڑے کا دسترخوان بچھایا گیا اور اسی پر پوری جماعت کا بچا کھچا کھانا رکھ دیا گیا۔ اس کے بعد آپؐ نے کھڑے ہو کر برکت کی دعا فرمائی، پھر لوگوں سے کہا کہ اپنے برتن لے کر آئیں اور جی بھر کر کھانا لے جائیں۔ لوگوں نے ایسا ہی کیا۔ جب سب لوگ فارغ ہو گئے تو آپؐ نے فرمایا: ''میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں''۔ ے

حضرت جابر بن عبداللہؓ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دستہ ساحل کی طرف روانہ فرمایا اور اس کا امیر حضرت ابوعبیدہ ابن الجراحؓ کو مقرر فرمایا۔ دستہ میں تین سو (۳۰۰) آدمی تھے، جن میں میں بھی تھا۔ راستے میں توشہ ختم ہو گیا۔ حضرت ابوعبیدہؓ نے تمام شرکائے سفر کو اپنے توشے ایک جگہ جمع کرنے کا حکم دیا، چنانچہ تمام توشے یکجا کیے گئے تو صرف دو تھیلے ہوئے۔ ہم لوگوں کو اسی جمع شدہ پونجی سے بہت تھوڑا تھوڑا دیا جاتا تھا، یہاں تک کہ ہر آدمی کے حصے میں صرف ایک ایک چھوارہ آنے لگا .....۔ ۸

یہ تینوں واقعات عہد نبوی کے ہیں۔ ان سب میں قدر مشترک یہ ہے کہ انفرادی خطرات کو اجتماعی تعاون کے ذریعہ دور یا کم کیا گیا اور خود نبی کریم ﷺ نے اس میں شرکت کی یا اس کی تحسین فرمائی، اس لیے کہ اگر اس طرح نہ کیا جاتا تو ممکن تھا کہ کئی لوگ ہلاک ہو جاتے یا ناقابل تلافی نقصان کا شکار ہوتے۔

یہ واقعات اس بات کی بھی عملی مثال ہیں کہ خطرات سے تحفظ کے لیے جو اجتماعی تعاون کی راہ اختیار کی جائے گی اس میں اصل ملکیت کے لحاظ سے گو افراد متفاوت ہوں گے، لیکن باہم اشتراک کے بعد ہر شخص مساوی درجہ کا استحقاق رکھے گا اور اس کو 'غرر' یا 'ربا' نہیں بلکہ تعاون قرار دیا جائے گا۔ یہ اجتماعی تکافل ہے، جس کا مقصد یہ ہے کہ افراد کے مصالح کو پروان چڑھایا جائے اور ان کے مضرات کو دور کیا جائے۔

اس مضمون کی سب سے بلیغ تعبیر اس حدیث پاک میں آئی ہے:

المؤمن للمؤمن کالبنیان یشد بعضهٗ بعضاً۔ ۹	مومن، مومن کے لیے ایک عمارت کی طرح ہے، جس میں ایک حصہ دوسرے حصے کو تقویت پہنچاتا ہے۔

مستقبل کے لیے احتیاطی تدابیر

ہنگامی حالات سے بچنے اور مستقبل کے لیے احتیاطی تدابیر اختیار کرنا توکل کے خلاف نہیں ہے۔ یہ دنیا دارالاسباب ہے۔ یہاں اسباب سے بے نیاز ہوکر زندگی نہیں گذاری جاسکتی۔ اسی لیے اسلام نے اسباب کو اختیار کرنے کی ہدایت دی ہے اور ترک اسباب سے روکا ہے۔ ایک صاحب نے اللہ کے رسول ﷺ سے دریافت کیا: کیا اللہ پر توکل کا مطلب یہ ہے کہ میں اپنی اونٹنی کو کھلا چھوڑ دوں۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا:

اعقلها وتوكل[۱۰] اپنی اونٹنی کو باندھو، پھر توکل کرو۔

خود نبی کریم ﷺ عام حالات میں (معجزات اور خوارق عادات کا استثناء کرکے) اسباب کو اختیار فرماتے تھے۔ اگر اسباب سے بے نیاز ہوکر محض توکل کی قوت سے تمام مسائل کو حل کرنا ممکن ہوتا تو اسلام کی اشاعت کے لیے آپؐ کو سخت ترین مجاہدوں، دعوتی اسفار، دفاعی اقدامات اور جنگ و جہاد کی کوئی ضرورت نہ ہوتی۔ آپؐ سے بڑھ کر کوئی صاحب توکل نہیں۔ آپ نے فاقے کیے، قرض لیے، دوا علاج کرایا، دوران سفر سواریاں استعمال فرمائیں، ہتھیار رکھے، تکلیفیں اٹھائیں وغیرہ۔ اگر اس دنیا میں اسباب کے بغیر بھی عادۃً کام ہوسکتا تھا تو آپؐ کو یہ تکلیفیں اٹھانے کی ضرورت نہ تھی، تمام کام محض دعا اور اشارۂ غیبی سے انجام پا جاتے۔ اس لیے سبب کے درجے میں آئندہ کے لیے احتیاطی تدابیر توکل و ایمان کے ہرگز منافی نہیں ہے۔ قرآن کریم میں حضرت یوسف علیہ السلام کی زبانی حکومت مصر کو بطور احتیاط مستقبل کی منصوبہ بندی کا جو مشورہ دیا گیا وہ اس باب میں بہترین نمونہ ہے۔ انھوں نے آنے والے قحط کے نقصانات سے بچنے کے لیے حکومت مصر کو مشورہ دیا تھا:

قَالَ تَزْرَعُونَ سَبْعَ سِنِينَ دَأَباً فَمَا حَصَدتُّمْ فَذَرُوهُ فِي سُنبُلِهِ إِلاَّ قَلِيلاً مِّمَّا تَأْكُلُونَ. ثُمَّ يَأْتِي مِن بَعْدِ ذَلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَأْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ إِلاَّ قَلِيلاً مِّمَّا

انھوں نے فرمایا: تم سات سال تک جم کر کھیتی کرو، پھر جو پیداوار ہو اس کو اس کی بالیوں ہی میں چھوڑ دو، صرف تھوڑا سا کھانے کے بقدر نکال لو، پھر اس کے بعد شدید قحط کے سات سال آئیں گے، جو تمہارے سارے ذخیرے کو

تُحْصِنُونَ. ثُمَّ يَأْتِيْ مِن بَعْدِ ذَلِكَ عَامٌ فِيْهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيْهِ يَعْصِرُونَ.
(یوسف: ۴۷-۴۹)

ختم کردیں گے، صرف بیج کے بقدر جو تم نے بچا کر رکھا ہوگا وہ بچ جائے گا، پھر اس کے بعد جو سال آئے گا اس میں خوب بارش ہوگی اور لوگ خوب فائدہ اٹھائیں گے۔

ایک نمونہ سنت نبوی میں ملتا ہے۔

حجۃ الوداع کے موقع پر حضرت سعد بن وقاصؓ بیمار تھے، اللہ کے رسول ﷺ ان کی عیادت کو تشریف لے گئے۔ اس موقع پر انھوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میں اپنے پورے مال کی وصیت کردوں؟ آپؐ نے فرمایا: نہیں۔ انھوں نے عرض کیا: نصف کی؟ آپؐ نے فرمایا: نہیں۔ انھوں نے عرض کیا: تہائی کی؟ تو آپؐ نے فرمایا: ہاں، تہائی کی وصیت کردو اور یہ بہت زیادہ ہے۔ پھر آپؐ نے ارشاد فرمایا:

إنک أن تدع ورثتک أغنیاء خیر من أن تدعهم عالة یتکففون الناس فی أیدیهم. [۱۱]

تم اپنے ورثہ کو اچھی مالی حالت میں چھوڑ کر جاؤ یہ اس سے بہتر ہے کہ تم ان کو محتاج چھوڑ کر جاؤ اور وہ اپنے کفاف کے لیے لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے پر مجبور ہوں۔

یہ وہ اساسی تصورات ہیں جن پر ایک بہتر اسلامی انشورنس (تکافل) کی تشکیل کی جاسکتی ہے، اور ان کی مدد سے عام لوگوں کو ہنگامی حالات میں آسانیاں فراہم کی جاسکتی ہیں۔

انشورنس کی چند ذیلی بنیادیں

اس ضمن میں بعض ذیلی مباحث کی طرف بھی اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، جن سے اسلام کے نظامِ تکافل کی تشکیل میں مدد ملتی ہے۔ شریعت اسلامی میں کئی ایسی مثالیں موجود ہیں جن میں شدید ترین حالات میں فرد کے نقصان کو جماعت پر تقسیم کیا گیا ہے، تاکہ ناقابل برداشت کو قابل برداشت میں تبدیل کیا جائے۔

عاقلہ کا نظام

اسلام میں قتل خطا اور شبہ عمد کی صورت میں دیت کو عاقلہ سے وابستہ کیا گیا ہے۔ صحیح

حدیث میں مروی ہے کہ:

أن رسول الله ﷺ قضیٰ دیة المرأة علیٰ عاقلتها ۱۲؎

رسول اللہ ﷺ نے عورت کی دیت کا ذمہ دار عاقلہ کو قرار دیا۔

ایک دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں:

قضیٰ رسول الله ﷺ أن العقل علیٰ عصبتها ۱۳؎

رسول اللہ ﷺ نے فیصلہ فرمایا کہ عورت کی دیت اس کے عصبہ (رشتہ دار) ادا کریں گے۔

عاقلہ کی حدود میں حنفیہ کے نزدیک خاندان کے علاوہ، ہم پیشہ، ہم فکر، ہم مسلک اور دیگر ہم رشتہ افراد بھی شامل ہیں ۔۱۴؎

ظاہر ہے کہ اس کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ اس طرح کے جرائم میں جن میں انسان پر اچانک بہت بڑا مالی تاوان عائد ہوجاتا ہے اور عام حالات میں اس کے لیے یہ ناقابل برداشت ہوتا ہے، اگر اسے پوری جماعت پر تقسیم کردیا جائے تو یہ قابل برداشت ہوجائے گا۔ علامہ سرخسیؒ نے اس حکمت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

وکل احد لایأمن علیٰ نفسه أن یبتلی بمثله، وعندذلک یحتاج إلیٰ إعانة غیره، فینبغی أن یعین من ابتلی لیعینهٗ غیرهٗ إذاابتلی بمثله، کماهو العادة بین الناس فی التعاون والتوادّ، فهذا هو صورة أمّة منتصرة وجبلة قوم قوّامین بالقسط شهداء لله متعاونین علی البرّ والتقویٰ. ۱۵؎

کوئی بھی انسان اس طرح کی غلطیوں میں مبتلا ہوسکتا ہے اور ایسے ہی موقع پر دوسرے کی مدد کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس لیے چاہئے کہ اس طرح کی مصیبت میں دوسرے کی مدد کی جائے، تاکہ وقت آنے پر دوسرا بھی اس کی مدد کرے۔ تعاون کے معاملے میں لوگوں کی عادت یہی ہے، اور مددگار امت کی تصویر اور انصاف قائم کرنے والی قوم کی جبلّت یہی ہے اور یہی شہداء للہ اور برو تقویٰ کے علم برداروں کی شان ہے۔

عقدِ موالات

عقد موالات بھی بعض حالات میں دیت کی تقسیم اور ذمہ داریوں کی تخفیف کا سبب

بنتا ہے۔ بہت سے فقہاء اس کو سبب تسلیم نہیں کرتے، لیکن فقہاء حنفیہ کے یہاں اصل وارثین کے نہ ہونے کی صورت میں یہ وراثت ودیت کی فی الجملہ بنیاد بنتا ہے۔[۱۶]

ظاہر ہے کہ اس نظریہ کی اساس بھی اسی جذبۂ تعاون پر ہے، جس میں ایک اجنبی شخص کو بعض شرائط کے ساتھ محض معاہدہ کی وجہ سے شراکت مل جاتی ہے۔ یہ تصور قرآن کریم کی اس آیت پاک سے ماخوذ ہے:

وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ أَيْمَانُكُمْ فَآتُوهُمْ نَصِيبَهُمْ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيداً۔ (النساء:۳۳)	جن لوگوں نے تم سے عہد کیا ہے ان کو ان کا حصہ دے دو، بے شک اللہ ہر چیز پر گواہ ہے۔

آیت کریمہ میں 'نصیب' کی ایک تفسیر میراث سے کی گئی ہے۔[۱۷]

معروف کا التزام

فقہاء مالکیہ کے یہاں ایک جزئیہ ملتا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی معروف چیز کا التزام کرلے جو اس پر پہلے سے لازم نہیں تھی، مثلاً کسی کو صدقہ، ہبہ یا عاریت پر کوئی چیز فراہم کرنے کا عہد کرنا، کسی کی خدمت یا رہائش کے انتظام کا التزام کرنا، کسی کی کفالت یا ضمان قبول کرنا وغیرہ تو ان کے نزدیک التزام کی بنا پر وہ چیز اس کے ذمہ لازم ہوجاتی ہے، الّا یہ کہ وہ شخص ہی مرجائے، یا غربت وافلاس کا شکار ہوجائے۔ اس کی توجیہ امام مالکؒ نے یہ فرمائی ہے:

لان ذلک معروف والمعروف من أوجبهٗ علیٰ نفسهٖ لزمه.[۱۸]	اس لیے کہ یہ معروف ہے اور معروف کو جب انسان اپنے ذمہ لازم کرتا ہے تو وہ لازم ہوجاتا ہے۔

علامہ ابن رشدؒ نے اس کی تشریح اس طرح کی ہے:

فهذا امر قد أوجبهٗ علیٰ نفسهٖ والمعروف علیٰ مذهب مالک وجمیع اصحابهٖ لازم لمن أوجبهٗ علیٰ نفسهٖ مالم یمت أو یفلس[۱۹]	اس چیز کو اس نے اپنے ذمہ لازم کرلیا اور مذہب مالکی کے مطابق معروف کو جب آدمی اپنے ذمہ لازم کرلیتا ہے تو جب تک موت یا افلاس کا شکار نہ ہو، وہ چیز اس کے ذمہ لازم رہتی ہے۔

ظاہر ہے کہ التزام کی بنا پر جو ذمہ داریاں انسان پر عائد ہوتی ہیں ان میں سے دوسرے ایسے اشخاص کا تعاون بھی ہے جو اپنے طور پر ان ذمہ داریوں کو ادا کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ اس طرح فقہ مالکی کا یہ نظریہ ذمہ داریوں کی تقسیم کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

مشروط ہبہ

اسلام میں زکوٰۃ وصدقات کے علاوہ ہبہ کے ذریعہ بھی ضرورت مندوں کی امداد کی تلقین کی گئی ہے۔ اس کا فائدہ اخروی اجر وثواب کے علاوہ کبھی دنیا ہی میں لوٹنے والے فائدے کی صورت میں بھی ظاہر ہوتا ہے۔ اسی لیے علماء میں یہ بات زیر بحث رہی ہے کہ اگر کوئی شخص ہبہ کے ساتھ اپنے فائدے کی کوئی شرط لگادے تو یہ مقتضائے عقد کے موافق ہوگا یا خلاف؟ امام شافعیؒ کے ایک قول کو چھوڑ کر جمہور فقہاء کی رائے یہ ہے کہ یہ مقتضائے عقد کے خلاف نہیں ہے اور اگر اس کا منشا پورا نہ ہو تو وہ ہبہ کو فسخ کرسکتا ہے۔ گویا یہ ایک طرح سے تعاون کا تبادلہ ہے، جس کی ضرورت دنیا کی زندگی میں کسی کو بھی پڑسکتی ہے۔ علامہ بابرتیؒ شرح ہدایہ میں لکھتے ہیں:

لان العادة الظاهرة أن الانسان يهدى إلىٰ من فوقهٗ ليصونهٗ بجاههٖ وإلى من دونه ليخدمهٗ والىٰ من يساويه ليعوضهٗ، وإذاتطرق الخلل فيماهو المقصود من العقد يتمكن العاقد من الفسخ كالمشترى إذا وجد بالمبيع عيباً فثبت لهٗ ولاية الفسخ عند فوات المقصود إذ العقد يقبلهٗ .[۲۰]

اس لیے کہ عام رواج یہی ہے کہ انسان اپنے سے اوپر والے کو ہدیہ اس لیے دیتا ہے کہ اس کی عزت وعظمت کی وجہ سے اس کا تحفظ ہو اور اپنے سے نیچے والے کو اس لیے دیتا ہے کہ اس کی خدمت کرے، اور اپنے برابر والے کو اس لیے دیتا ہے کہ اسے اس کا بدلہ ملے۔ لیکن جب مقصد میں خلل پیدا ہوجائے تو عاقد کو فسخ عقد کا اختیار حاصل ہوگا، جس طرح کہ مشتری کو اگر صحیح سالم سامان نہ ملے تو اسے بیع کے فسخ کرنے کا اختیار ہوتا ہے، اس لیے کہ عقد میں اس کی گنجائش موجود ہے۔

اس کا مأخذ دراصل ایک حدیث پاک ہے:

الرجل احقّ بھبتہٖ مالم یثب منھا[۲۱] انسان اپنے ہبہ کا زیادہ حق دار ہے جب تک کہ اس کا معاوضہ نہ لے۔

اس مضمون کی متعدد روایات کتب حدیث، مثلاً ابن ماجہ (۷/ ۳۱۰) مصنف ابن ابی شیبۃ (۶/ ۴۷۴)، مستدرک حاکم (۲/ ۵۲) اور سنن بیہقی (۶/ ۱۸۱) میں آئی ہیں۔

ان روایات سے تعاون برائے تعاون کا نظریہ اخذ کیا گیا ہے، جو اسلامی انشورنس کے لیے بنیاد بن سکتا ہے۔

عمریٰ ورقبیٰ

عمریٰ بھی ہبہ ہی کی ایک قسم ہے، مگر اس میں عمر بھر کی قید لگی ہوتی ہے۔ دینے والا اس طرح دیتا ہے کہ مثال کے طور پر میرا یہ گھر تا حیات تیرے لیے ہے، کبھی یہ شرط بھی لگا دی جاتی ہے کہ تیرے مرنے کے بعد یہ جائداد واپس میری ہوگی۔ اس طرح کے مشروط ہبہ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اس میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔ جمہور علماء اس طرح کے مشروط معاملے کو درست نہیں سمجھتے۔ حنفیہ شرط کو باطل کہتے ہیں[۲۲] شافعیہ عقد ہی کو ناجائز کہتے ہیں۔[۲۳] مالکیہ کی رائے یہ ہے کہ اس طرح کا مشروط معاملہ درست ہے اور ہبہ پر دی ہوئی چیز اس شخص کے مرنے کے بعد اس کے قدیم مالک کو لوٹ جائے گی۔[۲۴] حنابلہ حنفیہ کے ہم خیال ہیں اور ایک روایت مالکیہ کے مطابق بھی ہے۔[۲۵]

اسی سے ملتی جلتی صورت رقبیٰ کی ہے، جس کا تذکرہ قدیم کتب فقہ میں ملتا ہے۔ اس کی صورت یہ ہوتی تھی کہ ہبہ کرنے والا اس طرح کہتا کہ یہ چیز تیرے لیے ہے۔ اگر تو پہلے مرگیا تو یہ چیز میری ہوگی اور اگر پہلے میں مرگیا تو یہ تیری ہی رہے گی۔ اس میں بھی فقہاء کا اختلاف ہے۔ عام طور پر حنفیہ اس طرح کے عقد کو سرے سے باطل قرار دیتے ہیں، جب کہ دوسرے فقہاء اس کو درست کہتے ہیں اور شرط کے مطابق سامان ہبہ کرنے والے کو واپس لوٹانے کے قائل ہیں۔

ہبہ میں قبضہ کی اہمیت

ہبہ کے ذیل میں ایک بحث یہ آتی ہے کہ کیا ہبہ محض عقد سے مکمل ہوجاتا ہے یا اس کے لیے قبضہ بھی ضروری ہے۔ جمہور فقہاء قبضہ کو ضروری قرار دیتے ہیں اور اس کے بغیر ہبہ کی کارروائی کو مکمل نہیں کہتے، جب کہ امام مالکؒ قبضہ کی شرط نہیں لگاتے ہیں، نہ اس کی صحت کے لیے اور نہ اس کی تکمیل کے لیے۔ ان کے نزدیک محض قبول کر لینا ہبہ کے لازم ہونے کے لیے کافی ہے۔ انہوں نے اس کو بیع پر قیاس کیا ہے۔[۲۶] حنابلہ کے یہاں تھوڑی تفصیل ہے۔ وہ ناپ تول کی چیزوں میں قبضہ کو ضروری قرار دیتے ہیں، لیکن ان کے علاوہ دیگر چیزوں میں ہبہ کے لازم ہونے کے لیے محض عقد کو کافی کہتے ہیں۔[۲۷] یہ دراصل دونوں رجحانات کو جمع کرنے کی کوشش ہے۔ جمہور فقہاء کے نزدیک یہ عقد تبرع ہے۔ اگر قبضہ کے بغیر ہی یہ لازم اور واجب الاداء ہوجائے تو یہ عقد تبرع کے بجائے عقد ضمان ہوجائے گا، جو کہ خلاف مفروض ہے، نیز اس سلسلے میں حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور دیگر صحابہؓ سے جو آثار منقول ہیں ان سے عام طور پر صحابہ کا موقف یہی نظر آتا ہے کہ قبضہ کے بغیر ہبہ مکمل نہیں ہوتا۔[۲۸]

اگر اس کے ساتھ معاوضہ کی شرط لگ جائے تو بھی فی الجملہ اس کی حقیقت تبدیل نہیں ہوتی اور اس کے لزوم کے لیے قبضہ کی شرط برقرار رہتی ہے، البتہ معاوضہ کی قید آجانے کی بنا پر بیع سے تھوڑی مشابہت پیدا ہوجاتی ہے، وہ یہ کہ مناسب معاوضہ نہ ملنے کی صورت میں ہبہ کرنے والا اپنی چیز واپس لے سکتا ہے۔ حدیث میں ہے:

من وهب هبة يرى أنه إنما أراد بها الثواب فهو علىٰ هبته يرجع فيها إذا لم يرض منها. [۲۹]	جو شخص کسی کو کوئی چیز ہبہ کرے جس کا مقصد معاوضہ لینا ہو اور معاملہ اس کی مرضی کے مطابق نہ ہو تو وہ اپنا ہبہ واپس لے سکتا ہے۔

اسلام کے نظامِ تکافل کا اجمالی خاکہ

مذکورہ بالا اصول ونظریات کی روشنی میں ایک ایسا نظامِ تکافل مرتب کیا جاسکتا ہے، جو تعاون اور تبرع کے جذبہ پر مبنی ہو، مالی بنیادوں پر مستحکم اور خود کفیل ہو، ربا، قمار، مکر وفریب اور

ظلم وعدوان کے فاسد عناصر سے پاک ہو اور جو اپنے شرکاء کی امیدوں کے لیے موجودہ مروجہ انشورنس کمپنیوں سے کسی طرح کم نہ ہو۔

اس سلسلے میں پہلی بنیادی بات یہ ہے کہ کسی چیز کے جائز ہونے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ نظام یا معاملہ قرآن وحدیث یا خیرالقرون میں صراحۃً موجود ہو، بلکہ صرف اس قدر کافی ہے کہ معاملہ کی صورت قرآن وحدیث اور شریعت اسلامیہ کے کسی حکم سے متصادم نہ ہو، مقاصد شریعت کے خلاف نہ ہو، شرعی مفاسد سے پاک ہو اور عام لوگوں کے لیے مفید ہو۔ جمہور فقہاء کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اشیاء (عبادات کو چھوڑ کر) میں اصل اباحت ہے۔[۳۰] اکثر حنفیہ، شافعیہ، حنابلہ اور مالکیہ میں ابوالفرج عمرو بن محمد اللیثی البغدادی المالکی کی یہی رائے ہے۔[۳۱]

دوسری بات یہ ہے کہ اگر کسی معاملے کی شرائط فریقین میں باہم رضامندی سے طے پاجائیں اور بنیادی طور پر اس میں کوئی چیز خلاف شرع نہ ہو اور ان کی غرض بھی درست ہو تو وہ معاملہ درست ہوگا اور اس میں طے شدہ شرائط کی پابندی تمام فریقوں پر لازم ہوگی، اس لیے کہ اسلام میں عہد کی پابندی اور معاملات کی شفافیت کی بڑی تاکید آئی ہے۔ (المائدۃ:۱، الاسراء:۳۴)

حضرت عمرو بن عوف مزنیؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

المسلمون عند شروطهم إلا شرطاً حرّم حلالاً او احلّ حراماً [۳۲]	مسلمان اپنی شرطوں کے پابند ہیں، سوائے اس شرط کے جو کسی حلال کو حرام یا حرام کو حلال بنائے۔

اس طرح کسی ایسے معاملے میں جو فریقین یا چند افراد کے درمیان طے پائے اور اس کی مقررہ شرائط شریعت کے خلاف نہ ہوں تو ان کی رعایت ضروری ہوگی۔ کوئی مباح چیز جب عقد کے دائرے میں آجاتی ہے تو وہ لازم ہوجاتی ہے۔

اسلامی انشورنس کے بنیادی نکات

مذکورہ بالا اصول وقواعد کی روشنی میں ایک ایسے تکافلی نظام کا خاکہ تیار ہوسکتا ہے، جس کو اسلامی انشورنس کہا جاسکتا ہے۔ اس کے درج ذیل نکات ہوسکتے ہیں:

شرعی بورڈ کا قیام

ایک ایسی مالیاتی کمپنی بنائی جائے جس میں کوئی شرط یا معاملہ خلاف شریعت نہ ہو اور اس کا جمع شدہ سرمایہ ایسے بینکوں میں نہ رکھا جائے جہاں سودی یا غیر شرعی کاروبار ہوتا ہو، اگرچہ وہ معاملہ بالکل جدید نوعیت کا ہو اور پچھلے زمانے میں اس طرح کا کوئی معاملہ پیش نہ آیا ہو۔

اس کے لیے مناسب ہے کہ کوئی شرعی نگراں بورڈ قائم کیا جائے جو کمپنی کے جملہ معاملات کی کڑی نگرانی رکھے اور اس کا فیصلہ ہر حال میں قابل قبول اور واجب التنفیذ ہو۔

عقدِ تبرّع

کمپنی کے فارم میں یہ صراحت کی جائے کہ یہ عقد تبرّع ہے اور میں یہ سرمایہ بطور تبرّع جمع کر رہا ہوں، اس کا مقصد مصیبت و پریشانی کے وقت پریشان حال ممبروں کا تعاون کرنا ہے، خواہ اس کی نوبت خود مجھے پیش آئے یا کسی دوسرے ممبر کو، البتہ جمع شدہ سرمایہ کو منجمد رکھنے کے بجائے اس کو کسی جائز نفع بخش تجارت میں لگایا جائے اور اس کے منافع سے کمپنی کے انتظامی امور انجام دیئے جائیں، اور باقی ماندہ منافع ممبران پر ان کے سرمایہ کے تناسب سے تقسیم کر دیے جائیں۔

عقدِ معاوضہ اور عقدِ تبرّع میں فرق

دراصل عقد معاوضہ اور عقد تبرّع دونوں میں بڑا فرق ہے۔ عقد معاوضہ نتیجہ کے اعتبار سے عقد ضمان بنتا ہے اور اس میں معاملات کی تمام شقوں کی مکمل وضاحت ضروری ہوتی ہے۔ اگر اس میں کوئی بھی بنیادی شق مجہول رہ جائے جس سے کہ نزاع کا اندیشہ ہو تو سرے سے وہ معاملہ ہی فاسد ہو جائے گا۔ اس کے بالمقابل عقد تبرّع میں بڑی وسعت ہے۔ یہ یک طرفہ معاملہ ہوتا ہے اور اس کی بنیاد ایثار و رتعاون کے جذبہ پر ہوتی ہے، جس میں کسی سے کسی کا کوئی مطالبہ نہیں ہوتا، اسی لیے کسی بات کے غیر واضح رہ جانے کی صورت میں عموماً کسی نزاع کا بھی اندیشہ نہیں ہوتا۔

عقد معاوضہ کا مزاج قرآن کریم کی اس آیت سے سمجھ میں آتا ہے:

يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ لاَ تَأْكُلُواْ أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلاَّ أَن تَكُونَ تِجَارَةً عَن تَرَاضٍ مِّنكُمْ۔(النساء:۲۹)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اپنے مال ناجائز طور پر مت کھاؤ، مگر یہ کہ تجارت کے طور پر ہو اور باہمی رضامندی سے ہو۔

یعنی معاملے کی تمام شقیں روشنی میں آئیں اور باہم رضامندی سے ان کو طے کیا جائے۔ اگر کوئی بات بھی کسی ایک فریق پر غیر واضح رہ جاتی ہے تو اس کی رضامندی بھی مشتبہ ہوجاتی ہے۔ اسی لیے حضور اکرم ﷺ نے بیع کی ان صورتوں سے منع فرمایا جن میں معاملہ کی بنیادی شق مجہول اور قابل نزاع ہوتی تھی اور عہد جاہلیت میں ان کا رواج تھا، مثلاً بیع حصاۃ، بیع غرر، بیع ملامسۃ، بیع منابذۃ، بیع حبل الحبلۃ اور بیع مجہول وغیرہ۔[۳۳]

عقد تبرع کی مثال میں ہبہ، صدقہ، ابراء، خلع اور صلح وغیرہ کو پیش کیا جاسکتا ہے۔

علامہ قرافیؒ نے دونوں طرح کے معاملات کے اس فرق پر اچھی روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے ایک عنوان قائم کیا ہے: **الفرق الرابع والعشرون بين قاعدة ماتؤثر فيه الجهالات والغرر وقاعدة مالايؤثر فيه ذلك من التصرفات** اور اس کے تحت دونوں طرح کے معاملات کی مثالیں دے کر واضح کیا ہے کہ کن معاملات میں ناواقفیت مؤثر ہوتی ہے اور کن میں نہیں؟ انہوں نے معاملات وتصرفات کی تین قسمیں کی ہیں: (۱) خالص عقدِ معاوضہ جیسے بیع وشراء وغیرہ (۲) خالص عقدِ احسان جیسے ہبہ، صدقہ وغیرہ (۳) دونوں کے بین بین معاملات، جیسے عقد نکاح۔ خالص عقدِ معاوضہ جہالت وغرر کی بنا پر فاسد ہوجاتا ہے۔ خالص عقدِ احسان پر جہالت سے فرق نہیں پڑتا اور درمیانی عقد میں غرر قلیل اثر انداز نہیں ہوتا، لیکن غرر کثیر مؤثر ہوتا ہے، البتہ حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک ہبہ وغیرہ میں بھی غرر وجہالت نقصان دہ ہے۔[۳۴]

انشورنس کمپنی اگر تبرّع وایثار کی بنیاد پر لوگوں سے سرمایہ جمع کرنے کی اپیل کرتی ہے اور آفات وبلیّات کے مواقع پر اپنے شرکاء کا مالی تعاون کرتی ہے تو یہ معاملہ عقدِ احسان کے زمرے میں داخل ہوگا اور فی الجملہ اس میں غرر وجہالت کی گنجائش ہوگی اور یہ اس نہد

(مشترک خرچ برداشت کرنا) کی نظیر بن جائے گی جس کی تحسین خود سرکار دوعالم ﷺ نے فرمائی ہے اور جس کے بارے میں امام بخاریؒ کا بیان ہے کہ قرون اولیٰ کے مسلمانوں کے نزدیک اس میں کچھ حرج نہیں سمجھا جاتا تھا۔[۳۵]

اس طرح تبرّع کی بنیاد پر قائم ہونے والے اسلامی انشورنس میں اگر نقصانات یا منافع کی شرح یقینی طور پر معلوم نہ ہو اور فی الجملہ اس میں غرر و جہالت کا امکان موجود ہو تب بھی شرعی طور پر یہ معاملہ فاسد نہیں ہوگا اور اس پر قمار، ظلم یا اکل حرام کا اطلاق نہیں ہوگا، اس لیے کہ یہ عقدِ معاوضہ نہیں، بلکہ عقد تبرع قرار پائے گا۔

علاوہ ازیں عقود و معاملات میں صرف وہ جہالت مفسدِ عقد بنتی ہے جو باعثِ نزاع ہو، ہر جہالت نہیں۔ فقہاء نے اس کی صراحت کی ہے۔ علامہ فخرالدین زیلعی نے ایک مالی معاملے میں جہالت کو غیر مؤثر بتاتے ہوئے اصولی بات لکھی ہے:

لان هذه الجهالة لاتفضی إلی المنازعة وهی المانعة لامجرد الجهالة[۳۶]	اس لیے کہ یہ جہالت باعثِ نزاع نہیں ہے اور یہی (نزاع والی جہالت) مانعِ عقد بنتی ہے مطلق جہالت نہیں۔

علامہ کاسانیؒ لکھتے ہیں:

أن الجهالة لاتمنع جواز العقد لعينها بل لافضائها إلیٰ المنازعة.[۳۷]

اس طرح کی عبارتیں الفاظ کے تھوڑے فرق کے ساتھ البحرالرائق (۱۵/ ۱۴۶)، المحیط البرہانی (۱۸۴/۱۴)، المبسوط للسرخسی (باب مکاتبۃ ام الولد، ۲۰۶/۹)، فتح القدیر (کتاب العاریۃ، ۴۲۳/۱۹)، دررالحکام شرح غررالاحکام لملا خسرو (باب مایعقد بہ البیع، ۱۶۰/۶)، حاشیۃ ابن عابدین (باب الشہادۃ علی الشہادۃ، ۲۲۳/۷) وغیرہ میں بھی موجود ہیں۔

ظاہر ہے جس عقد کی بنیاد تبرع پر ہو اس میں فی الجملہ عموماً جہالت باعثِ نزاع نہیں بنتی، اس لیے وہ مفسدِ عقد بھی نہیں بنے گی۔

ایک شبہ کا ازالہ

اسلامی انشورنس کے عقدِ تبرّع ہونے پر ایک شبہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس میں جمع شدہ اقساط کے مقابلے میں کمپنی بوقت مصیبت معاوضہ ادا کرتی ہے۔ پھر یہ عقد تبرع کہاں ہوا؟ لیکن یہ شبہ محض سطحی ہے، شریعت اسلامیہ میں متعدد ایسے عقود ہیں جو اصلاً تبرع کے لیے ہونے کے باوجود معاوضہ کے معنیٰ کی گنجائش رکھتے ہیں۔ مثلاً ہبہ اصلاً ایک تبرّع ہے، لیکن اگر کوئی عوض کی شرط لگائے یا امید رکھے تو اس کی شرعاً گنجائش ہے۔ نہد، جس کا رواج قرون اولیٰ میں تھا، وہ بھی دراصل تبرع کا اجتماعی تبادلہ ہے۔ قرض خالص تبرّع ہے، لیکن اس میں بھی معاوضہ کا معنیٰ لایا جا سکتا ہے، مثلاً کوئی شخص اس شرط پر قرض دے کہ دوسرا شخص بھی اسے قرض دے، تو بعض فقہاء کے یہاں اس کی گنجائش نظر آتی ہے۔ فقہائے حنابلہ میں علامہ علاء الدین مرداوی دمشقی رقمطراز ہیں:

ویجوز قرض المنافع مثل أن یحصد معهٗ یوماً ویحصد معهٗ الآخر یوماً أو یسکنهٗ داراً لیسکنهٗ الآخر بدلها. ۳۸

منافع کا قرض جائز ہے، مثلاً ایک دن وہ اس کے ساتھ کٹائی کرے اور دوسرے دن دوسرا اس کے ساتھ کٹائی کرے، یا کسی کو اپنے گھر میں رہائش دے، تاکہ وہ بھی اسے اپنے گھر میں رہائش دے۔

قتل خطا یا قتل شبہ عمد میں دیت عاقلہ کے ذمہ عائد کی گئی ہے۔ یہ اصلاً قاتل کا عاقلہ کی طرف سے تعاون ہے، لیکن اس میں بھی معاوضہ کا معنیٰ موجود ہے، اس لیے کہ یہ نظام اسی بنیاد پر قائم کیا گیا ہے کہ آئندہ اگر عاقلہ میں سے کسی دوسرے شخص کو ایسی نوبت آئے تو یہ قاتل بھی اس میں مالی تعاون کرے گا۔ یہ تبرع کے بدلے تبرع ہے، وغیرہ۔

انشورنس کمپنی سرمایہ کی مالک نہیں

انشورنس کمپنی جمع شدہ سرمایے کی مالک نہیں، بلکہ انتظامی معاملات میں جملہ شرکاء کی طرف سے وکیل ہوگی اور وکیل ہی کی حیثیت سے انتظامی اور ترقیاتی امور انجام دے گی اور نفع ونقصان میں سرمایہ کے تناسب سے تمام شرکاء برابر کے شریک ہوں گے۔ نفع ہوگا تو صرف

کمپنی کا نہیں اور خسارہ بھی ہوگا تو صرف کمپنی کا نہیں۔ البتہ کمپنی اس کام پر ممبران سے مناسب شرح پر اجرت وصول کرسکتی ہے اور بلا اجرت بھی کام کرسکتی ہے۔ بلا اجرت کام کرنے کی صورت میں کمپنی کے انتظامی اخراجات کاروبار میں لگے سرمایہ سے وصول کیے جائیں گے۔ موجودہ معلومات کے مطابق تکافل پر مبنی کمپنیاں دونوں طرح سے کام کر رہی ہیں۔ مثلاً اردن کی کمپنی شرکۃ التامین الاسلامیۃ الاردنیۃ اجرت پر انتظامی کام انجام دیتی ہے، جبکہ قطر کی کمپنی الشرکۃ الاسلامیۃ القطریۃ انتظامی کام پر کوئی اجرت نہیں لیتی۔

وکالت پر اجرت

شریعتِ اسلامی میں وکالت پر اجرت لینے کی گنجائش ہے۔ علامہ کاسانی فرماتے ہیں:

وشركة الاعمال جائزة بلاخلاف بين أصحابنا، لانّ مبناها على الوكالة والوكالة علىٰ هذا الوجه جائزة بأن يوكل خياط أوقصار وكيلاً يتقبل له عمل الخياطة والقصارة، وكذايجوز لكل صانع يعمل بأجر أن يوكل وكيلاًيتقبل العمل. ۳۹	اعمال میں شرکت بالاتفاق جائز ہے، اس لیے کہ اس کی بنیاد وکالت پر ہے اور وکالت اس طریق پر جائز ہے کہ کسی درزی یا دھوبی کو وکیل بنایا جائے جو دھوبی یا درزی کے عمل کو قبول کرے۔ یہی حکم ہر صنعت کا رکا ہے جو اجرت پر کام کرتا ہو۔ اس کو ایسے عمل کا وکیل بنایا جاسکتا ہے جس کو وہ قبول کرلے۔

علاوہ ازیں عہد نبوت اور عہد خلافت راشدہ میں زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے باقاعدہ عمال مقرر تھے اور اس پر ان کو اجرت بھی ملتی تھی، مثلاً طبقات ابن سعد میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے صدقہ وصول کرنے کے لیے چند افراد عرب کے مختلف علاقوں میں ۹ھ میں روانہ فرمائے۔ ۴۰ ابوداؤد میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کے لیے ابومسعودؓ کو مقرر فرمایا۔ ۴۱ مسند احمد میں ابوجہم بن حذیفہؓ، عقبہ بن عامرؓ، ضحاک بن قیسؓ کے اسماء گرامی ملتے ہیں۔ ۴۲ مستدرک حاکم میں حضرت قیس بن سعدؓ اور حضرت ولید بن عقبہؓ (قبیلہ بنی مصطلق کی طرف) کے نام ہیں۔ ۴۳ عہد صدیقی اور عہد فاروقی میں بھی اس کام کے لیے افراد مقرر تھے۔ بعض روایتوں میں ابن اللتبیہ الازدی، ابن السعدی وغیرہ ناموں کی تصریح بھی ملتی ہے۔ ۴۴

سرمایہ پر کمپنی کا قبضہ، قبضۂ ضمان ہے

اس صورت میں، جب کہ کمپنی اجرت پر کام انجام دے، سرمایہ پر کمپنی کا قبضہ، قبضۂ ضمان قرار پائے گا اور کسی طرح کی کوتاہی یا لاپرواہی ثابت ہونے پر کمپنی ضامن ہوگی۔ ہدایہ میں ہے:

وعلیٰ ھذا سائر الوکالات، والبیّاع والسمسار یجبران علی التقاضی لانھما یعملان باجرۃ عادۃً. ۴۵

وکالت کی تمام صورتوں کا یہی حکم ہے، خرید وفروخت کرانے والے اور دلال کو ادائی پر مجبور کیا جائے گا، اس لیے کہ وہ عموماً اجرت پر کام کرتے ہیں۔

کمپنی کی اجازت کے بغیر فسخِ عقد کی اجازت نہیں

دوسری طرف عقدِ وکالت اصولی طور پر اگرچہ عقد جائز ہے، لازم نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود عقد وکالت مکمل ہوجانے کے بعد ممبران (موکلین) کو اجازت نہ ہوگی کہ کمپنی (وکیل) سے اس کی مرضی اور اجازت کے بغیر یک طرفہ طور پر علٰحدگی اختیار کریں اور طے شدہ معاملہ کو منسوخ کریں اس کے کئی اسباب ہیں:

(۱) اس سے دوسرے کا حق متعلق ہو چکا ہے اور فسخِ عقد میں غرر اور ضرر دونوں کا اندیشہ ہے جس کی شریعت میں اجازت نہیں۔ حدیث میں ہے:

لاضرر ولاضرار ۴۶ نہ نقصان اٹھاؤ نہ دوسرے کو نقصان پہنچاؤ۔

جمہور حنفیہ ومالکیہ کی رائے یہی ہے اور امام شافعیؒ واحمدؒ کا بھی ایک قول یہی ہے۔ ۴۷

(۲) اگر اس معاملہ کو وعدۂ ملزمہ یا ہبہ بالعوض پر قیاس کیا جائے تو بھی اس کو طرفین کی رضامندی کے بغیر ختم نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے کہ ان صورتوں میں نتیجہ کے لحاظ سے یہ عقد معاوضہ بن جاتا ہے۔ ۴۸

(۳) اگر مالکیہ کے نقطۂ نظر سے التزام بالتبرع پر انشورنس کے مسئلے کو قیاس کیا جائے تو بھی تبرع واحسان کے التزام کے بعد اس سے مکرنے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔

بچی ہوئی آمدنی ممبران کی ملک ہوگی

چونکہ یہ مکمل سرمایہ پالیسی خریدنے والوں کا ہوگا، کمپنی اس کی مالک نہیں، بلکہ صرف وکیل ہوگی، اس لیے نفع ونقصان میں تمام ممبران شریک ہوں گے اور انتظامی اخراجات اور آفات ونقصانات میں حسب شرائط معاوضات کی ادائیگی کے بعد بچا ہوا سرمایہ ممبران کو ان کے سرمایہ کے تناسب سے واپس کیا جائے گا اور اس کے بعد بھی اگر کچھ رہ جائے تو جملہ شرکاء کی اجازت سے اس کو کسی کار خیر میں لگایا جاسکتا ہے، یا اس کو ریزرو کوٹے میں رکھا جائے جو کبھی ہنگامی صورت میں کام آئے۔اس کو عربی میں احتیاطی کہا جاتا ہے۔

سرمایہ کاری شرعی مضاربت کے اصول پر کی جائے

جمع شدہ سرمایہ کو مضاربت کے شرعی ضوابط کے مطابق جو کتب فقہ میں معروف ہیں، کاروبار میں لگایا جائے۔ اس میں کمپنی کی حیثیت مضارب کی اور پالیسی ہولڈرز کی حیثیت ربّ المال کی ہوگی اور مقررہ شرائط کے ساتھ مقررہ تناسب پر منافع کی تقسیم عمل میں آئے گی، جس میں کسی طرح کی خیانت، لاپروائی یا غرر وضرر کا معاملہ روا ہوگا۔

اس تناظر میں اس کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ سرمایہ کو سرمایہ کاری کے لیے دینا اگرچہ ایک اختیاری عمل ہے، لیکن معاملہ شروع ہوجانے کے بعد یہ اختیاری نہیں رہتا۔ فقہاء مالکیہ کے نزدیک یہ عقد ملزم بن جاتا ہے۔ حنفیہ کے نزدیک جواز فسخ کے لیے دوسرے فریق کی رضامندی شرط ہے، اس لیے کہ اس سے دوسرے کا حق متعلق ہوجاتا ہے اور دوسرے کو اس سے ضرر پہنچ سکتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ سرمایہ نقد کی صورت میں موجود ہو، اگر وہ سامان وعروض میں تبدیل ہوجائے تو بھی مضاربت کو ختم کرنا ممکن نہ ہوگا۔[۴۹] شافعیہ اور حنابلہ اس معاملے میں بہت نرم ہیں۔[۵۰]

اقساط ومعاوضات میں یکسانیت ضروری نہیں

اسلامی انشورنس کا یہ طریقہ چوں کہ عربوں کے طریقۂ نہد سے قریب ہے، جس کی سرکار دوعالم ﷺ نے تحسین فرمائی ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ اقساط ومعاوضات کی ادائی میں تناسب و

یکسانیت ضروری نہ ہو، اس لیے کہ اس کی بنیاد اصلاً معاوضہ پر نہیں، بلکہ تبرع واحسان پر ہے، اس لیے اس میں توسع کی گنجائش ہے اور اس کو نہ غرر کہا جائے گا، نہ ضرر، نہ ظلم وعدوان، نہ ربا، نہ قمار۔

شرکت کے اکثر معاملات میں اس قدر فرق و امتیاز رکھنا عموماً آسان نہیں ہوتا، اخراجات اور جدوجہد میں تمام شرکاء کا برابر حصہ نہیں ہوتا، جو ایک واضح حقیقت ہے، مگر اس کے باجود شریعت مطہرہ نے معاملات میں شرکت کی اجازت دی ہے۔ اس کی علت بھی تعاون باہم ہی ہے، اس لیے کہ کئی ایسے معاملات ہیں جن کو تنہا ایک شخص انجام نہیں دے سکتا، ان میں کئی افراد کے تعاون کی ضرورت ہوتی ہے۔

حسابات میں شفافیت

حسابات کا شفاف نظام رکھا جائے، جس میں کم از کم دو حسابات بنیادی ہیں: ایک میں کمپنی میں سرمایہ جمع کرنے اور آفات کے وقت معاوضات کی ادائی کی مکمل تفصیلات ہوں اور دوسرے میں سرمایہ کاری اور تقسیم منافع کی تفصیلات ہوں۔ ان دونوں حسابات کے علاوہ اور بھی ضمنی حسابات کی ضرورت ہو تو وہ بھی پوری امانت داری کے ساتھ تیار کیے جائیں۔ اگر کسی مد میں وقتی طور پر سرمایہ کی کمی ہو تو دوسرے مد سے قرض لیا جاسکتا ہے، بشرطیکہ لین دین کا سارا حساب شفافیت کے ساتھ رکھا جائے۔

معاملات ومسائل میں حقیقی اشتراک

نفع ونقصان اور ذمہ داری واستحقاق دونوں چیزوں میں کمپنی انتظامیہ اور سرمایہ جمع کرنے والے ممبران کا مکمل اور حقیقی اشتراک ہونا چاہئے۔ حالات کے تغیرات اور عالمی قدروں کی تبدیلیوں کی بنا پر جو مسائل پیدا ہوں ان کا مقابلہ بھی سب کو مساوی طور پر کرنا ہے، کوئی ذمہ داری کسی فریق پر یک طرفہ عائد نہیں ہوگی۔

بہتر یہ ہے کہ کمپنی کے بنیادی مسائل میں ممبران کی بھی نمائندگی ہو، بایں طور کہ سرمایہ کے تناسب سے چند افراد کو منتخب کرلیا جائے، جو کمپنی کی انتظامی کمیٹی کا تعاون کریں۔ اس سے دونوں طرف اعتماد بحال رہے گا اور کمپنی کا نظام استحکام کے ساتھ جاری رہے گا۔

ریزرو فنڈ

دنیا میں موجود نظامِ تکافل پر مبنی بعض کمپنیوں میں ریزرو فنڈ کا سسٹم رائج ہے، جس کو عربی میں احتیاطی کہا جاتا ہے۔ یہ ہنگامی حالات میں کمپنی کو مالی بحران اور دیوالیہ پن سے بچانے کے لیے معاون ثابت ہوتا ہے۔ اس سسٹم کی افادیت کا جائزہ لیتے ہوئے اس سے استفادہ کیا جانا چاہئے۔

قانونی ماہرین کی ایک ٹیم

کسی بھی مالی ادارے کو عام طور پر بعض خطرات سے دوچار ہونا پڑ سکتا ہے۔ مثلاً قدرتی آفات، سیلاب، طوفان اور زلزلہ وغیرہ، جدید صنعتی خطرات الیکٹرک یا الیکٹرانک مسائل، ابلاغ وترسیل کے جدید وسائل کا بحران وغیرہ، ارضی یا فضائی درجۂ حرارت کے اتار چڑھاؤ سے پیدا شدہ ہنگامی صورت حال، کمپنی کے بیرون یا اندرون میں خیانت وبدعملی کی سازشیں، دوسری غیر اسلامی انشورنس کمپنیوں کے مقابلہ جاتی چیلنجز، اسلامی انشورنش کمپنیوں کے مضبوط پس منظر کا فقدان، حساب کتاب کی عدم شفافیت، انتظامی معاملات یا سرمایہ کاری میں صحیح شرعی خطوط سے انحراف اور سود پر چلنے والے بینکوں سے مالی تعاون، عالمی یا وقتی قانونی رکاوٹیں، نفع ونقصان میں اعداد وشمار کا بحران وغیرہ۔ ان پر نگاہ رکھنے اور مشکلات کا حل نکالنے کے لیے ماہرین کی ایک ٹیم ہونی چاہئے، جو اس محاذ پر کمپنی کو تعاون دے سکے۔

یہ چند بنیادی خطوط ہیں، جن پر اسلامی انشورنس کمپنی کی تاسیس عمل میں آئے تو یہ ایک مبارک اور جائز قدم ہوگا۔ عالم اسلام کے متعدد علمی وفقہی اداروں (مثلاً ہیئۃ کبار العلماء، مجمع الفقہ الاسلامی جدہ وغیرہ) نے تجارتی انشورنس کے مقابلے میں مذکورہ بالا شرطوں کے ساتھ تعاونی انشورنس کی اجازت دی ہے اور اس قسم کی کمپنی کی سفارش کی ہے، مگر ایسا نہ ہو کہ صرف نام اسلامی رکھ لیا جائے اور اس کو دوسرے غیر اسلامی اداروں کی طرح شریعت کے تقاضوں سے قطع نظر محض سرمایہ اکٹھا کرنے کا ذریعہ بنا لیا جائے۔ اگر ایسا ہوا تو یہ عام تجارتی کمپنیوں سے بھی زیادہ خطرناک اور گم راہ کن ہوگا۔ بعض عرب محققین نے ایسی کئی کمپنیوں کی

نشان دہی کی ہے، جو اسلام یا تعاون کا لیبل لگا کر اسی طریق کار پر عمل پیرا ہیں جو غیر اسلامی انشورنس کمپنیوں کا ہے، اس لیے اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

مسلم ملکوں میں اس قسم کے متعدد تجربات شروع ہوئے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ہندوستان جیسے غیر مسلم ملکوں میں بھی اس کی طرف پیش رفت کی جائے اور قانونی ماہرین سے مشورہ کر کے کوئی مناسب اور متبادل لائحۂ عمل تیار کیا جائے۔

حواشی و مراجع

۱۔ مقدمہ ابن خلدون، دار الشعب، ص ۳۵۵

۲۔ ردالمحتار، ۴/۱۷۰

۳۔ صحیح مسلم، باب کراء الارض، حدیث نمبر ۳۹۹۹

۴۔ صحیح مسلم، باب استحباب المواساۃ بفضول المال، حدیث نمبر ۳۲۵۸

۵۔ سیرت ابن ہشام ۱/۵۰۱، الروض الانف للسہیلی ۲/۳۴۵، عیون الاثر لابن سید الناس ۱/۲۶۰، النہایۃ فی غریب الاثر لابن محمد الجزری ۳/۵۳۴

۶۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزہد، باب القناعۃ، حدیث نمبر ۴۱۴۱

۷۔ صحیح البخاری، کتاب الشرکۃ، باب الشرکۃ فی الطعام والنہد والعروض، حدیث نمبر ۲۴۲۲

۷۔ صحیح البخاری، کتاب الشرکۃ، حدیث نمبر ۲۴۲۰

۸۔ صحیح البخاری، حوالۂ بالا

۹۔ صحیح البخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب تشبیک الاصابع فی المسجد، حدیث نمبر ۴۸۱

۱۰۔ شعب الایمان للبیہقی، بیروت، ۲/۸۰

۱۱۔ صحیح البخاری، کتاب الوصایا، باب ان یترک ورثتہ أغنیاء، حدیث نمبر ۲۷۴۲

۱۲۔ صحیح البخاری، کتاب الدیات، باب جنین المرأۃ وأن العقل علیٰ الوالد، حدیث نمبر ۶۹۱۰، مسلم، باب الجنین، حدیث نمبر ۱۶۸۱

۱۳۔ صحیح البخاری، کتاب الفرائض، باب میراث المرأۃ والزوج مع الولد، حدیث نمبر ۶۷۴۰

۱۴۔ المبسوط، ۳۰/۳۱۰، کتاب المعاقل، بدایۃ المجتہد، ۲/۴۴۹

۱۵۔ المبسوط للسرخسی، ۳۰/۳۰۵

۱۶ حاشیۃ ابن عابدین، ۵/ ۷۸

۱۷ احکام القرآن للجصاص، ۲/ ۱۸۵

۱۸ التاج والاکلیل للعبدری الشہیر بالمواق، الحمالۃ بالکتابۃ ۸/ ۱۷۰، نقلاً عن المدونۃ کتاب الحمالۃ، تہذیب المدونۃ للقیروانی البرذاعی، ۳/ ۲۶۵

۱۹ البیان والتحصیل والشرح والتوجیہ والتعلیل لابی الولید محمد بن احمد بن رشد القرطبی، طبع بیروت، ۸/ ۴۳

۲۰ عنایۃ شرح الھدایۃ، طبع مصطفیٰ الحلبی، ۹/ ۴۰

۲۱ سنن دارقطنی، طبع وزارت اوقاف مصر، ۷/ ۲۷ حدیث نمبر ۳۰۱۴

۲۲ ہدایہ مع شرح العنایہ، ۹/ ۵۵

۲۳ روضۃ الطالبین للنووی، ۵/ ۳۷۰

۲۴ المدونۃ الکبریٰ، طبع دار الباز، ۶/ ۹۱

۲۵ المغنی لابن قدامۃ، ۵/ ۶۸۸

۲۶ بدایۃ المجتہد، طبع دار الجیل بیروت، ۲/ ۳۳۱

۲۷ المغنی، طبع الریاض، ۵/ ۶۵۳

۲۸ بدائع الصنائع، ۱۳/ ۳۰۶، فصل فی شرائط رکن الہبۃ

۲۹ موطا امام مالک، ۴/ ۱۰۹۲، طبع مؤسسۃ زائد بن سلطان، سنن بیہقی، باب المکافاۃ فی الہبۃ، ۳۰/ ۴۳۵، طبع وزارۃ الاوقاف مصر، شرح مشکل الآثار للطحاویؒ، ۱۳/ ۳۲، طبع مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت

۳۰ ارشاد الفحول للشوکانی، ص ۲۸۴، الوجیز فی ایضاح قواعد الفقہ الکلیۃ، ص ۱۲۹،

۳۱ تیسیر التحریر لمحمد امین امیر بادشاہ، ۲/ ۱۶۸، الاشباہ والنظائر للسیوطیؒ، ص ۶۰، التمہید للاسنویؒ، ۴/ ۲۷۱، شرح الکوکب المنیر لابن النجار، ۱/ ۳۲۵، ۳۲۶، إحکام الفصول، ص ۶۸۱، بحوالہ القواعد والضوابط الفقہیۃ المتضمنۃ للتیسیر لعبدالرحمٰن بن صالح عبداللطیف

۳۲ سنن الترمذی، کتاب الاحکام، حدیث نمبر ۱۴۰۳، سنن ابوداؤد، باب الصلح، حدیث نمبر ۳۵۹۶

۳۳ صحیح البخاری، حدیث نمبر ۳۴۹، مسلم، باب بیع الحصاۃ، حدیث نمبر ۲۷۸۳، مصنف عبدالرزاق، باب بیع المجہول والغرر، حدیث نمبر ۱۴۵۰۶

۳۴ انوار البروق فی انواع الفروق للقرافی، طبع بیروت، ۱/ ۲۷۶
۳۵ صحیح البخاری، کتاب الشرکۃ، باب الشرکۃ فی الطعام والنہد
۳۶ تبیین الحقائق، کتاب البیوع ۱۰/ ۲۳۸
۳۷ بدائع الصنائع، ۱۳/ ۹۵، کتاب الشرکۃ
۳۸ الانصاف فی معرفۃ الخلاف، باب القرض، طبع احیاء التراث بیروت، ۵/ ۹۶
۳۹ بدائع الصنائع، ۱۳/ ۹۸، کتاب الشرکۃ۔ اجرت پر وکالت کی بحث کے لیے درج ذیل کتابوں کی طرف مراجعت فرمائیں: حاشیۃ ابن عابدین، ۵/۴۹۴، تبیین الحقائق، ۴/۲۵۴، الشرح الکبیر للدردیر، ۳/ ۳۷۷، مغنی المحتاج، ۲/ ۲۱۷، المغنی لابن قدامۃ، ۷/ ۲۹۷، نیل الاوطار، ۷/ ۱۰
۴۰ التلخیص الحبیر للعسقلانی، ۲/ ۳۵۶، ط دار الکتب العلمیۃ، بیروت
۴۱ ابوداؤد، کتاب الخراج والامارۃ والفیء، باب فی غلول الصدقۃ، حدیث نمبر ۲۹۴۷
۴۲ مسند احمد، ۴/ ۱۴۰، ۱۵۷، ۲/ ۷۲
۴۳ مستدرک حاکم، ۱/ ۳۹۸
۴۴ صحیح البخاری، کتاب الزکاۃ، کتاب الاحکام، مسلم، کتاب الامارۃ، سنن بیہقی، ۴/ ۱۱۰
۴۵ ہدایہ، فصل فی العزل والقسمۃ، ۳/ ۲۰۹، طبع المکتبۃ الاسلامیۃ۔ اس مضمون کی عبارت فتاوی ہندیۃ، ۳/ ۵۶۷، عقد الجواہر الثمینۃ، ۲/ ۶۸۷، روضۃ الطالبین، ۳۲۵۴، کشف القناع، ۳/ ۴۸۴ وغیرہ میں بھی موجود ہے۔
۴۶ موطا امام مالک، ص ۴۶۴، مسند احمد، ۱/ ۳۱۳، ۵/ ۳۲۷، ابن ماجہ، ۲/ ۷۸۴
۴۷ بدائع الصنائع، ۱۲/ ۴۹۷ باب مایخرج بہ عن الوکالۃ، فتح القدیر لابن ہمام، فصل فی الوکالۃ فی الشراء، ۱۸/ ۲۷، تبیین الحقائق، ۴/ ۲۸۷، مواہب الجلیل، ۵/ ۱۸۷، بدایۃ المجتہد، ۲/ ۴۸۹، روضۃ الطالبین، ۴/ ۳۳۰
۴۸ الہدایہ مع شرحہ العنایہ، ۹/ ۴۰، طبع مصطفیٰ الحلبی، شرح الخرشی، طبع بولاق، مصر، ۷/ ۱۰۲
۴۹ بدایۃ المجتہد، ۲/ ۳۹۰، ۳۹۱، بدائع الصنائع، ۱۳/ ۲۶۴
۵۰ الشرح الصغیر، ۳/ ۷۰۵، ۷۰۶، روضۃ الطالبین، ۵/ ۱۴۱

☆☆☆

بحث ونظر

عہدِ نبوی کا تعلیمی نظام
اور موجودہ دور میں اس کی معنویت

پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی

اسلام دینِ رحمت ہے، نبی کریم خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ رحمۃ للعالمین ہیں اور قرآن کریم، جو آپؐ کے توسط سے لوگوں تک پہنچا، کتاب رحمت ہے۔ ان رحمتوں کا ایک بہت بڑا فیض یہ بھی ہے کہ علم کی قدر و قیمت دوبالا ہوئی، مختلف علوم وفنون کی ترقی کی راہیں ہموار ہوئیں اور تعلیمی سرگرمیاں فروغ پائیں۔ کتاب رحمت نے یہ حقیقت بے نقاب کی کہ اللہ کی نگاہ میں ان لوگوں کا مقام و مرتبہ بہت بلند ہے جو علم کی نعمت سے بہرہ ور ہیں (المجادلۃ :۱۱)، اہل علم کا موازنہ ان لوگوں سے نہیں کیا جاسکتا جو اس قیمتی دولت سے محروم ہیں (الزمر:۹)، جن لوگوں کو حکمت و دانائی عطا ہوئی وہ خیر کے خزانہ کے مالک بن گئے (البقرۃ: ۲۶۹)، علم میں ترقی کے لیے اللہ رب العزت سے دعا ہر حال میں مطلوب ہے (الکہف:۱۱۴)۔ قرآن کی اولین نزولی آیات میں علم کے اکتساب اور اس کے فروغ کے بنیادی ذرائع (قراءت و قلم) کا ذکر کرکے قرآن نے خود یہ واضح کردیا کہ یہ کتنی اہم اور قیمتی نعمت ہے اور اس کو ربِ اکرم کا فضل وکرم بتا کر اس کی قدر و قیمت مزید بڑھادی گئی۔ قرآن میں مطلق انداز میں علم میں اضافہ کے لیے دعا کی تلقین کی گئی (وَقُلْ رَبِّ زِدْنِی عِلْمًا، طہ:۱۱۴)۔ نبی کریم ﷺ نے 'علم نافع' کی دعا مانگ کر یہ حقیقت کھول دی کہ اسلام میں کس علم کا اکتساب مطلوب ہے اور نفع بخش علم کو صدقۂ جاریہ قرار دے کر اس کے حصول واستعمال کا رخ متعین کردیا۔ آپؐ کا یہ فرمان طلبِ علم کا زبردست محرک ہے کہ حکمت و دانائی مومن کی گم شدہ دولت ہے، وہ جہاں بھی مل جائے وہ اس کا زیادہ حق دار ہے۔[۱] اسی طرح آپؐ کا یہ قولِ بلیغ اہلِ علم کی عظمتِ شان کا شاہد ہے کہ

''زمین پر عالم کی مثال ایسی ہے جیسے آسمان پر ستاروں کی، جو خشکی و تری میں راہ دکھاتے ہیں۔ اگر یہ ماند پڑ جائیں تو راہ نما بھی بھٹک جائیں گے''۔[۲] تعلیم و تدریس میں مصروف رہنے والوں کا اس سے بڑھ کر اعزاز اور کیا ہوسکتا ہے کہ ایک دفعہ آپؐ نے مسجد نبویؐ میں دو حلقوں کا مشاہدہ کیا: ایک ذکر و دعا میں مصروف تھا اور دوسرا تعلّم و تعلیم میں۔ آپؐ نے دوسرے حلقہ میں یہ کہہ کر شرکت پسند فرمائی کہ ''انَّمَا بُعثت معلما'' (میں تو صرف معلّم بنا کر بھیجا گیا ہوں)۔[۳]

عہد نبویؐ کے تعلیمی نظام کا مطالعہ کرتے ہوئے سب سے اہم حقیقت جو سامنے آتی ہے وہ ہے تعلیم پر سب کا حق تسلیم کرنا اور اس حق کی ادائی کے لیے باقاعدہ اہتمام کرنا۔ موجودہ دور میں نہ صرف برصغیر، بلکہ پوری دنیا میں عوام کے حقِ تعلیم پر بہت زیادہ زور دیا جارہا ہے اور ہر طرف سے یہ آواز اٹھ رہی ہے کہ عوام کا یہ حق تسلیم کیا جائے اور حکومت کی جانب سے ہر شہری کو تعلیم کی سہولتیں فراہم کی جائیں۔ آج سے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال قبل حضور اکرمﷺ نے نہ صرف تعلیم کی ضرورت و اہمیت کا احساس دلایا اور اس کی طرف لوگوں کو راغب کیا، بلکہ مختلف طریقوں سے اس کی اشاعت کا اہتمام فرمایا اور باقاعدہ وسیع پیمانہ پر اس کا نظام قائم کیا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ایک ایسا تعلیمی انقلاب آیا کہ جو قوم نوشت و خواند سے نابلد تھی وہ علم و فن کی امام بن گئی اور جو لوگ تعلیم سے بے بہرہ تھے وہ معلّم و مودِّب کے فرائض انجام دینے لگے۔ آپؐ کا فرمان کہ علم کا حصول ہر مسلمان پر فرض ہے[۴] محض علم کا شوق دلانے کے لیے نہیں تھا، بلکہ والدین کو اس جانب متوجہ بھی کرنا تھا کہ اولاد کی تعلیم کا اہتمام ان کی ذمہ داری ہے۔ اس لیے اس کے بغیر طلب علم کا فریضہ ادا نہیں ہوسکتا۔ آپؐ نے بڑے موثر انداز میں والدین کو اس جانب راغب کیا۔ فرمایا:

ما نحل والد ولدا من نحل افضل من حسن ادب[۵]۔	والد کی طرف سے اولاد کے لیے بہترین تحفہ یہ ہے کہ وہ انھیں علم و ادب سکھائے۔

اس کے علاوہ بعض احادیث سے ان بچوں یا بچیوں کی تعلیم کے اہتمام کی ترغیب ملتی ہے جو کسی کے زیر کفالت ہوں، خاص طور سے کنیزوں کے سلسلہ میں رسول اکرمﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''جس شخص کے یہاں کوئی کنیز ہو، وہ اسے حسن ادب سکھائے اور اسے عمدہ تعلیم دلا کر آزاد کردے تو اسے دوہرا اجر ملے گا''۔[۶]

مساجد میں تعلیم کا نظم

عہد نبوی ﷺ میں تعلیم کی اشاعت کا سب سے اہم ذریعہ مساجد تھیں۔ یہاں عبادت کے ساتھ تعلیم وارشاد کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا۔ مسجد نبوی میں خود نبی کریم ﷺ تعلیم دیا کرتے تھے اور صحابۂ کرام بھی اس نیک کام میں مصروف رہتے تھے۔ آپؐ عام طور پر نماز سے فارغ ہونے کے بعد وہاں بیٹھ جاتے اور صحابہ کرام آپؐ سے قرآن، حدیث اور احکام کی تعلیم حاصل کرتے ۷۔ آپؐ کی تعلیم سے مستفیض ہونے والوں میں مقامی مسلمانوں کے علاوہ مختلف قبائل کے نمائندے اور بیرونی وفود کے لوگ بھی شامل ہوتے تھے۔ مسجد نبوی کے علاوہ مدینہ منورہ میں نو (۹) مساجد اور تھیں۔ ان سب میں بچوں کے لیے تعلیم کا نظام قائم تھا، جس کے تحت قرآن کی تعلیم پر خاص زور دیا جاتا تھا اور لکھنے کی مشق بھی کرائی جاتی تھی ۸۔ ان مساجد میں عام طور پر امام ہی تعلیم کے فرائض انجام دیتے تھے۔ ضرورت پڑنے پر دوسرے صحابہ بھی اس خدمت کے لیے مقرر ہوتے تھے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مدینہ کی بعض مساجد میں آپؐ کی ہجرتِ مدینہ سے قبل ہی تعلیم کا سلسلہ جاری ہو چکا تھا۔ شہر کے وسط میں تعمیر شدہ مسجد بنی زریق میں حضرت رافع بن مالکؓ معلم کے فرائض انجام دیتے تھے۔ انھیں مدینہ کے اولین معلم و مُقری ہونے کا شرف حاصل ہے ۹۔ مدینہ سے کچھ فاصلہ پر واقع مسجد قبا میں شروع ہی سے درس و تدریس کا نظم قائم تھا۔ اس میں حضرت سالم مولی ابوحذیفہؓ امامت کرتے تھے اور معلم کی خدمت بھی انجام دیتے تھے ۱۰۔ خاص بات یہ کہ مختلف مساجد میں تعلیم کا جو نظام چلتا تھا یا صحابہ کرام کے درس کے جو حلقے قائم تھے، نبی کریم ﷺ بذاتِ خود ان کی نگرانی کرتے تھے اور بعض اوقات ان میں شریک ہو کر شرکاء کی حوصلہ افزائی فرماتے تھے۔ مسجد قبا کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ آپؐ وقتاً فوقتاً وہاں تشریف لے جاتے اور اس کے مدرسہ کی دیکھ بھال کرتے ۱۱۔ حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ نبی کریم ﷺ مسجد نبوی میں تشریف فرما ہوئے، دیکھا کہ تعلیم دین کا ایک حلقہ قایم ہے، ایک صحابی قرآن پڑھا رہے ہیں، باقی لوگ سن رہے ہیں۔ قاری نے آپؐ کو دیکھا تو رک گئے اور آپ کو سلام کیا۔ آپؐ اس مجلس

میں بیٹھ گئے اور ہاتھ سے پڑھائی جاری رکھنے کا اشارہ کیا، مزید براں آپؐ نے اس اندازِ تعلیم پر مسرت ظاہر کی۔۱۲

مساجد میں تعلیم کا جو نظام قائم ہوا اس سے اصلاً مقصود یہ تھا کہ مقامی سطح پر تعلیم کی ضروریات پوری ہوتی رہیں، طلبہ کو بہ آسانی تعلیم کی سہولتیں مہیا ہوں اور ہر شخص کو تعلیم کے لیے مرکزی مسجد کا قصد نہ کرنا پڑے۔ یہ نکات بعض احادیث سے اخذ ہوتے ہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے حکم دیا کہ اپنے اپنے محلّہ کی مسجد میں اپنے ہم سایوں سے تعلیم حاصل کرو۱۳۔ اس دور کے لحاظ سے مقامی سطح پر تعلیم کو رواج دینے کی یہ ایک موثر تدبیر تھی۔ تعلیم کو عام کرنے کے سلسلہ میں آپؐ کا یہ فرمان بڑا معنٰی خیز ہے کہ ''ان پڑھ اپنے پڑوسیوں سے تعلیم حاصل کریں اور تعلیم یافتہ اپنے پڑوسیوں کو پڑھائیں۔ ایک دوسرے کو بری باتوں سے منع کریں اور اچھی باتوں کا حکم دیں''۱۴۔ تعلیم کے میدان میں تمام تر ترقیوں اور تعلیم کی اشاعت کے لیے بے پناہ وسائل کے باوجود دنیا آپؐ کے اس پُر حکمت قول کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔

تدریس کے انفرادی مراکز

نبی کریم ﷺ کی رہ نمائی میں تعلیم کا دوسرا نظام جو جاری ہوا وہ تدریس کے انفرادی مراکز تھے۔ متعدد صحابہ نے اپنے گھروں میں درس و تدریس کا سلسلہ قایم کر رکھا تھا۔ یہ حضرات بنیادی طور پر قرآن و حدیث کی تعلیم دیتے اور دین کے ضروری مسائل کی وضاحت فرماتے۔ کسی خاص فن میں انھیں اختصاص ہوتا تو وہ اسے خصوصی طور پر سکھاتے تھے اور جو لکھنا جانتے تھے وہ اس کی مشق کراتے تھے۔ سرزمین مکہ میں دارِ ارقم سے انفرادی درس گاہ کا یہ سلسلہ شروع ہوا تو مدنی زندگی میں اس کو اور وسعت ملی۔ اس ضمن میں خاص طور سے حضرت سعد بن خیثمہؓ، حضرت رافعؓ بن مالکؓ، حضرت اسعدؓ بن زرارہ، حضرت ابیؓ بن کعب، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت جابر بن عبداللہؓ، حضرت سعید بن العاصؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت شفاءؓ بنت عبداللہ عدویہ کے مکانات پر جاری رہنے والی تعلیمی سرگرمیاں بہت معروف ہیں۱۵۔ ان میں حضرت اسعد بن زرارہؓ کی درس گاہ خاص امتیاز رکھتی تھی، جس کا فیض ہجرتِ مدینہ سے پہلے جاری ہوگیا

تھا۔ اسی درس گاہ میں نبی کریم ﷺ کے مقرر کردہ معلّمین حضرت مصعب بن عمیرؓ اور حضرت عبداللہ بن امّ مکتومؓ نے درس و تدریس کا سلسلہ قائم کیا اور قرآن و سنت کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی، جیسا کہ اس درس گاہ کے ایک فیض یافتہ حضرت براء بن عازبؓ نے اپنا تجربہ بیان کیا ہے کہ ''یہ تعلیم گاہ قرآن و سنت کی تعلیم کا مرکز تھی۔ میں نے اس میں علم حاصل کیا اور سب سے پہلے قرآن پڑھا''[۱۶]۔ حضرت ابی بن کعبؓ کی درس گاہ حفظ، قراءت اور قرآن کریم کی تشریح و ترجمانی کے لیے مشہور تھی۔ یہ دارالقراء کے نام سے جانی جاتی تھی۔ مدینہ کے علاوہ دوسرے مقامات سے بھی طلبہ جوق در جوق آتے اور ان سے فیض اٹھاتے تھے[۱۷]۔ صحابیات میں ام المومنین حضرت عائشہؓ کی درس گاہ سب سے مشہور تھی، جو حجرۂ نبوی سے ملحق واقع تھی۔ اس درس گاہ سے فیض یاب ہونے والوں میں عورتیں، بچے اور بڑے سب شامل تھے۔ وہ قرآن و حدیث کی تعلیم کے علاوہ فقہی مسائل بڑی تفصیل سے بیان کرتیں اور اسرار شریعت کی وضاحت فرماتیں[۱۸]۔ تعلیم کی اشاعت میں ان کی ایک اور اہم خدمت یہ تھی کہ وہ بچوں اور بچیوں (خاص اپنے اعزہ کی اولاد) کو اپنی زیر تربیت رکھتی تھیں اور انھیں اچھی طرح تعلیم و تربیت سے آراستہ کرتی تھیں۔

صفۂ نبوی

عہد نبویؐ میں مدینہ میں تعلیم کا تیسرا اہم نظام درس گاہِ صفہ کی صورت میں جاری ہوا۔ یہ اجتماعی تعلیم و تربیت کا ایک عظیم مرکز تھا، جہاں تعلیم بالغان کا خصوصی اہتمام تھا۔ اسے عہد اسلام کا اولین اقامتی ادارہ بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے معلّم اعظم خود نبی کریم ﷺ تھے۔ آپؐ کی رہ نمائی میں اکابرِ صحابہ بھی علمی ضیا پاشیوں میں مصروف رہتے تھے اور دوسروں کو تعلیم سے بہرور کرنے میں پوری طرح منہمک رہتے تھے۔ اس درس گاہ کی انفرادیت یہ تھی کہ یہ مختلف کاموں میں مصروف رہنے والوں کی تعلیمی ضروریات پوری کرتی تھی، اس لیے کہ یہاں رات دن پڑھنے پڑھانے اور سیکھنے سکھانے کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ یہاں کے متعلمین میں بہت سے ایسے حضرات بھی تھے جو اپنی گھریلو مصروفیات جاری رکھتے تھے اور وقت نکال کر آپؐ

کے اس مثالی تعلیمی و تربیتی نظام سے فیض بھی اٹھاتے تھے۔ اس درس گاہ سے تعلیم کا ایک دوسرا انوکھا سلسلہ یہ جاری ہوا کہ بعض اصحابِ کرام مسجد نبویؐ سے دوری یا کسی مصروفیت کی وجہ سے روزانہ صفہ حاضر نہیں ہوسکتے تھے تو وہ اپنے کسی رفیق درس سے یہ طے کر لیتے کہ ایک دن وہ صفہ میں حاضر ہوں گے، دوسرے دن ان کے رفیق وہاں شریک تعلیم رہیں گے، تاکہ وہ ایک دوسرے سے غیر حاضری کے دن کی تعلیم کی تلافی کرتے رہیں اور فیضان نبویؐ کی برکات سے محرومی نہ رہے۔ حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عتبان بن مالکؓ کے مابین اس طرح کا ایک خوش گوار معاملہ بہت مشہور ہے۱۹۔ اس مرکز تعلیم کے طلبہ کی دوسری جماعت وہ تھی جس نے دینی تعلیم کے لیے اپنے آپ کو وقف کر رکھا تھا۔ وہ یہیں شب و روز بسر کرتے اور صحبت نبویؐ سے فیض یاب اور تعلیم و تعلم میں مصروف رہتے۔ دن میں یہ جگہ ان کی تعلیم گاہ ہوتی اور رات میں یہی ان کی اقامت گاہ بن جاتی۔ ان طلبہ کے قیام و طعام کا پورا نظم قایم تھا، جس کی نگرانی خود نبی کریم ﷺ فرماتے تھے اور صحابہ کرام انھیں تعاون دینے میں خوشی محسوس کرتے تھے۔ قرآن و حدیث کی تعلیم اور مسائل شریعت کی تفہیم کے ساتھ اس درس گاہ میں لکھنا بھی سکھایا جاتا تھا۔ حضرت عبادہ بن صامتؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے انھیں صفہ میں قرآن کی تعلیم اور کتابت سکھانے پر مامور کیا تھا ۲۰۔ حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت عبداللہ بن سعیدؓ اور حضرت سعد بن عبادہؓ بھی فن کتابت سکھاتے تھے۲۱۔ بعض سیرت نگاروں کے مطابق اصحاب صفہ میں بہت سے لوگوں کے لیے رات میں درس و تدریس کا وقت مقرر تھا۔ اس طرح یہ درس گاہ شبینہ تعلیم گاہ کا بھی کام دیتی تھی ۲۲۔ اس درس گاہ کے فیض یافتگان میں زراعت و تجارت پیشہ لوگ تھے اور غریب، نادار اور ایسے بے سہارا بھی جن کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ تعلیم و تربیت کے اس عظیم مرکز کی سرگرمیوں کی جو تفصیلات ملتی ہیں ان سے طلب علم کے وفورِ شوق، تعلیم کے فروغ میں حد درجہ انہماک اور تعلیم بالغان کے حسن انتظام کے ایسے نادر نمونے سامنے آتے ہیں، جن میں جدید دور کے طلبہ، اساتذہ اور تعلیمی اداروں کے منتظمین کے لیے بہت قیمتی سبق ملتا ہے اور تعلیم کے میدان میں آج بھی یہ بہترین مشعل راہ ثابت ہو سکتے ہیں۔

بچوں کی تعلیم

اس میں شبہ نہیں کہ تعلیم کے باب میں بچوں کی تعلیم بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ بچپن کا زمانہ ذہنی تربیت، علمی صلاحیت کی نشو ونما اور اخلاق و عادات کی تعمیر کا ہوتا ہے۔ اسی لیے یہ قول بہت مشہور ہے کہ بچپن میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے وہ دل و دماغ میں نقش ہوجاتا ہے۔ اس بات کے واضح ثبوت موجود ہیں کہ عہد نبویؐ میں بچوں کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دی گئی۔ یہ بات بڑی اہم ہے کہ نبی کریم ﷺ کی ہدایت تھی کہ بچہ کی پیدائش کے بعد اس کے کان میں سب سے پہلی جو آواز پڑے وہ اذان کے الفاظ ہوں۔ یہاں یہ واضح رہے کہ اُس زمانہ میں مساجد میں تعلیم کا جو نظام جاری ہوا اس میں بچوں کی تعلیم کا خاص اہتمام تھا۔ انھیں سب سے پہلے قرآن کریم پڑھایا جاتا تھا، پڑھنے لکھنے کی مشق کرائی جاتی تھی اور احادیث نبوی اور انبیاء کرام کے قصے بھی سنائے جاتے تھے[۲۳]۔ بعض جدید اسکالرس نے امام سیوطیؒ کی کتاب 'جمع الجوامع' کے حوالہ سے یہ ذکر کیا ہے کہ بچوں کو نماز پڑھنے کا طریقہ بتایا جاتا تھا اور انھیں نشانہ بازی و پیراکی بھی سکھائی جاتی تھی[۲۴]۔ بچوں کی تعلیم کی اہمیت اس سے واضح ہوتی ہے کہ آں حضرت ﷺ نے اسیرانِ بدر کا یہ فدیہ قرار دیا کہ وہ انصار کے بچوں یا کم عمر لڑکوں (غلمان) کو تعلیم دیں اور خاص طور سے انھیں لکھنا سکھائیں۔[۲۵]

مسجد نبویؐ میں نبی کریم ﷺ نے تعلیم و تذکیر کا جو مستقل سلسلہ جاری کیا اس میں بچوں یا کم سن صحابہ کی تعلیم کے لیے کوئی الگ سے نظم تو نہیں تھا، لیکن اس امر کے واضح ثبوت ملتے ہیں کہ کم سن صحابہ بھی آپؐ کی مجلس میں شریک ہوتے تھے۔ آپؐ انھیں قرآن کی تعلیم دیتے، روز مرہ زندگی سے متعلق اپنے ارشادات عالیہ سے نوازتے یا دین کے مسائل واضح فرماتے۔ وہ ان سب سے مستفیض ہوتے تھے۔ آپؐ کی مبارک مجلس کے شرکاء میں متعدد ایسے صحابہ کا ذکر ملتا ہے جن کی عمر آٹھ (۸) سے پندرہ (۱۵) برس کے درمیان تھی۔ ان میں حضرت حسین بن علیؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت انس بن مالکؓ، حضرت عمر بن ابی سلمہؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور حضرت ابوسعید خدریؓ کے اسماء گرامی شامل ہیں۔ امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں بچوں کو قرآن پڑھانے کا باقاعدہ ایک باب (باب تعلیم الصبیان القرآن) قائم کیا ہے[۲۶]۔

نبی کریم ﷺ کی تعلیمی و تربیتی مجلس کے حاضرین میں ایک کم سن صحابی کی ایک دلچسپ روایت یہ بیان کی جاتی ہے کہ ایک دفعہ آپؐ نے حاضرین سے پوچھا: بتاؤ وہ کون سا درخت ہے جس کے پتے نہیں جھڑتے اور وہ مومن سے مشابہت رکھتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ میرے ذہن میں آیا کہ یہ کھجور کا درخت ہے، لیکن کم سنی کی وجہ سے میں خاموش رہا اور جواب دینے کی جرأت نہ کرسکا۔ بعد میں نبی کریم ﷺ نے خود اس کا جواب دیا کہ یہ کھجور کا درخت ہے۔ راوی کے بقول انھیں زندگی بھر حسرت رہی کہ کاش انھوں نے اس وقت جرأت کرکے اپنا خیال ظاہر کردیا ہوتا[۲۷]۔ اسی طرح حضرت سمرہ بن جندبؓ بیان کرتے ہیں کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں کم سن لڑکے تھے اور آپؐ کی مجلس میں احادیث سن کر یاد کرتے تھے، مجلس میں ان سے زیادہ عمر والے لوگ ہوتے تھے، اس لیے وہ بات نہیں کرسکتے تھے[۲۸]۔ حضرت جندب بن عبداللہ بجلیؓ روایت کرتے ہیں کہ ہم نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں لڑکے (غلمان) تھے۔ پہلے ہم نے ایمان سیکھا، پھر قرآن پڑھا، جس کی وجہ سے ہمارا ایمان پختہ ہوگیا[۲۹]۔ بعض روایات سے یہ ثبوت بھی ملتا ہے کہ دور دراز مقامات سے جو وفود دین کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے مدینہ آتے تھے ان میں بڑوں کے ساتھ بچے بھی ہوتے تھے اور وہ بڑے شوق سے علم دین حاصل کرتے تھے[۳۰]۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بچپن ہی سے علم کے شائق تھے۔ کم سنی میں اسلام قبول کرنے کے بعد آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ مجھے تعلیم سے نوازیے۔ آپؐ نے ان کی درخواست کو شرفِ قبولیت بخشا اور وہ اسی روز سے آپؐ سے قرآن کی تعلیم حاصل کرنے لگے۔[۳۱]

عہد نبوی میں صحابۂ کرام کا قرآن سے اتنا غیر معمولی شغف تھا کہ وہ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، حضر و سفر، ہر جگہ قرآن پڑھتے اور سناتے رہتے تھے۔ بہت سے لوگ، جن میں بعض اوقات غیر مسلم بچے بھی ہوتے تھے، ان سے قرآن سن کر یاد کرلیتے تھے۔ اس سلسلہ میں بعض دلچسپ واقعات بیان کیے جاتے ہیں۔ حضرت عمرو بن سلمہؓ کا گھر ایک عام راستہ پر چشمہ کے کنارے تھا، جہاں مسافر آتے جاتے آرام کرتے تھے۔ وہ وہاں لڑکوں کے ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ مسلمان ہونے سے پہلے وہ ابھی چھ سات سال کے تھے کہ انھوں نے مسلم

مسافروں سے قرآن سن کر کچھ سورتیں یاد کر لی تھیں۔ بعد میں جب ان کا قبیلہ اسلام لایا تو انہی کم سن صحابی کو نماز میں امام بنایا جاتا تھا، اس لیے کہ اپنے خاندان میں انہی کو قرآن کا سب سے زیادہ علم حاصل تھا[۳۲]۔ ہجرت کے بعد جب نبی کریم ﷺ مدینہ تشریف لائے اس وقت حضرت زید بن ثابتؓ گیارہ برس کے تھے۔ قبول اسلام کے بعد انہیں آپؐ کی خدمت میں پیش کیا گیا تو ان کا تعارف اس طور پر کرایا گیا کہ انھیں سولہ (۱۶) سورتیں یاد ہیں۔ آپؐ نے اس پر بڑی مسرت کا اظہار کیا[۳۳]۔ یہ وضاحت نہیں مل پائی کہ انھوں نے کس سے قرآن پڑھا تھا۔ اس امکان سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ مدینہ کے اولین معلّمین یا ان کے تربیت یافتہ انصار سے فیض یاب ہوئے ہوں۔

عورتوں کی تعلیم

عہدِ نبویؐ کی تعلیمی سرگرمیوں کا تیسرا اہم پہلو عورتوں کی تعلیم پر توجہ اور اس کا اہتمام تھا۔ نبی کریم ﷺ نے طلبِ علم کی جو رغبت دلائی اور مختلف انداز میں اشاعتِ تعلیم کی جو اہمیت واضح کی وہ مرد و زن کی تفریق کے بغیر سب کے لیے ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا: ''جس شخص کی تین لڑکیاں ہوں، وہ ان کی پرورش کرے، انھیں ادب سکھائے یعنی تعلیم و تربیت دے، پھر ان کا نکاح کردے اور ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے اسے جنت نصیب ہوگی''[۳۴]۔ نبی کریم ﷺ نے خود اپنے گھر کی عورتوں کی تعلیم و تربیت میں خصوصی دلچسپی لی اور دوسروں میں بھی اس کے لیے تحریک پیدا کی۔ آپؐ نے مدینہ میں جو اسلامی نظامِ تعلیم قائم کیا اس میں قرآن کی تعلیم ہر مرد و زن اور چھوٹے بڑے کے لیے لازمی تھی۔ مختلف مساجد یا اس سے ملحق مکاتب میں ابتدائی تعلیم کا جو نظم جاری ہوا اس سے بچے اور بچیاں دونوں فائدہ اٹھاتی تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آپؐ نے خواتین کی تعلیم کا آغاز اپنے گھر سے کیا۔ حضرت عائشہؓ قرآن و حدیث کی عالمہ تھیں، اسرارِ شریعت سے بخوبی واقف تھیں، شعر و ادب اور علم انساب پر ان کی گہری نظر تھی۔ ان کا مسکنِ مبارک تعلیم و مذاکرہ کا مرکز ہونے کی وجہ سے دارالعلوم بن گیا تھا۔ پہلے ان کے والد محترم حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ان کی تعلیم و تربیت کی، پھر کاشانۂ نبوت سے

منسلک ہونے کے بعد ان کے علم وفضل کو چار چاند لگ گئے، یہاں تک کہ بڑے بڑے صحابہ ان سے رجوع کرتے تھے۳۵۔ ام المومنین حضرت ام سلمہؓ بھی مختلف علوم، بالخصوص علم حدیث میں مہارت رکھتی تھیں۔اس میں بھی نبی کریم ﷺ کی تعلیم وتربیت کا فیض تھا۔حضرت حفصہؓ کی تعلیم میں آپؐ کی دلچسپی کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ آپؐ نے حضرت شفاء بنت عبداللہؓ سے فرمایا تھا کہ وہ انھیں خاص طور سے لکھنا سکھادیں ۳۶۔ حضرت فاطمہ زہراؓ کی پرورش وتربیت بیت النبیؐ کے مبارک ماحول میں ہوئی۔ام المومنین حضرت خدیجہؓ ان کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دیتی تھیں۔حضور اکرم ﷺ تاحیات ان کی تربیت فرماتے رہے۔

بعض واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ عورتوں کی تعلیم کا سلسلہ انفرادی طور پر مکی زندگی ہی میں شروع ہو چکا تھا۔ یہ واقعہ بہت مشہور ہے کہ حضرت خباب بن ارتؓ حضرت عمرؓ کی بہن اور بہنوئی کو ان کے گھر پر قرآن پڑھایا کرتے تھے۔اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بعض صحابہ مسلمانوں کے گھروں پر قرآن کی تعلیم دیتے تھے۔ہجرتِ مدینہ کے بعد جب آپؐ نے اس شہر مقدس میں تعلیم وتربیت کا نظام وسیع پیمانہ پر قایم کیا اور مسجد نبویؐ میں روزانہ آپؐ کی تعلیم و تذکیر کا سلسلہ جاری ہوا، جس سے صحابہ کرام مستفیض ہوتے تھے تو صحابیات میں بھی دین کی تعلیم حاصل کرنے اور احکام و مسائل سمجھنے کا شدید شوق پیدا ہوا۔انھوں نے آپؐ سے خاص طور پر خواتین کو دینی تعلیم دینے اور دین کے احکام سکھانے کے لیے ایک دن مقرر کرنے کی فرمائش کی۔آپؐ نے ان کی درخواست کو قبول فرمایا اور ان کی تعلیم و تذکیر کے لیے ایک دن مخصوص کردیا۔آپؐ مقررہ دن پر انھیں قرآن وحدیث کی تعلیم دیتے اور روزمرہ زندگی میں دین کے احکام ومسائل سے بھی انھیں واقف کراتے۔صحابیاتؓ مسائل کو مزید سمجھنے کے لیے آپؐ سے سوالات بھی کرتی تھیں، جن کے آپؐ جواب عنایت فرماتے ۳۷۔کبھی کوئی استفسار عورتوں کے مخصوص مسائل سے متعلق ہوتا تو آپؐ ازواجِ مطہرات کے توسط سے ان کا جواب عنایت فرماتے ۳۸۔ان تمام باتوں سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ عورتوں کی عام تعلیم کے علاوہ انہیں فقہی مسائل سے واقف کرانے کا اہتمام ضروری ہے۔اس سے یہ سبق بھی ملتا ہے کہ عورتوں کے مخصوص مسائل کو سمجھنے سمجھانے کے لیے ان کا تعاون حاصل کرنا نہ صرف مناسب،

بلکہ ضروری ہے۔ یہ ضرورت ایک دوسری ضرورت کی طرف متوجہ کرتی ہے اور وہ ہے خواتین کی بہتر تعلیم و تربیت کا اہتمام۔ جدید دور میں خواتین کی دینی تعلیم کے اہتمام کے علاوہ بعض جدید علوم بالخصوص میڈیکل سائنس کے علم امراض نسواں (Gynaecology) اور علم الولادت (Obstatrics) میں ان کی مہارت کی ضرورت وافادیت دن بہ دن بڑھتی جارہی ہے۔ یہاں یہ وضاحت بھی اہمیت سے خالی نہ ہوگی کہ رسول اکرم ﷺ نے نہ صرف خواتین کی تعلیم و تربیت پر زور دیا، بلکہ ان میں تعلیم کی اشاعت کے لیے بھی تحریک پیدا کی، خاص طور سے خواتین کو پڑھانے لکھانے کی ترغیب دی۔ معلّمہ کی حیثیت سے حضرت عائشہؓ اور حضرت ام سلمہؓ کی خدمات بہت معروف ہیں۔ ان کے علاوہ حضرت ام درداءؓ، حضرت شفا بنت عبداللہؓ، حضرت ام کلثوم بنت عقبہؓ اور حضرت عائشہ بنت سعدؓ بھی علم کی اشاعت میں دلچسپی لیتی تھیں۳۹۔

وفود کی تعلیم و تربیت

حضور اکرم ﷺ کے تعلیمی نظام کا چوتھا اہم پہلو بیرون مدینہ سے آنے والے لوگوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام تھا۔ یہ لوگ عام طور پر نومسلم ہوتے، جو اپنے قبائل کے نمائندہ کی حیثیت سے وفد کی صورت میں دین کا علم حاصل کرنے کے لیے مدینہ حاضر ہوتے، یا غیر مسلم ہوتے جو اسلامی عقاید و تعلیمات کو جاننے اور سمجھنے کے لیے مدینہ آتے۔ آپؐ تعلیم و تربیت کے علاوہ ان کے رہنے سہنے اور کھانے پینے کا نظم بھی فرماتے۔ بعض اوقات کسی صحابی یا صحابہ کی جماعت کو ان کی تعلیم و تربیت پر مامور فرمادیتے۔ واپسی کے وقت آپؐ وفد کے ارکان کو تلقین فرماتے کہ وہ اپنی قوم میں جاکر دینی تعلیم کی اشاعت کریں۔ اگر وہ اپنے علاقہ میں معلم بھیجنے کی درخواست کرتے تو آپؐ اس کا نظم فرماتے۔ اس بات کو چند واقعات سے واضح کیا جاسکتا ہے۔ جب بحرین کا وفد عبدالقیس مدینہ حاضر ہوا اور یہ طلب ظاہر کی کہ انھیں دین کی باتیں سکھائی جائیں تو نبی کریم ﷺ نے انھیں بنیادی عقائد، فرض عبادات اور ضروری احکام کی تعلیم دی اور انھیں واپس جاکر اپنے لوگوں کو ان باتوں کے سکھانے کی ہدایت دی۔ بعد میں انھیں انصار کے سپرد کیا کہ وہ ان کے کھانے پینے کے انتظام کے ساتھ انھیں تعلیم بھی دیتے رہیں۔ آپؐ کے

دریافت کرنے پر وفد کے لوگوں نے جو تاثرات بیان کیے ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن وسنت کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی گئی تھی ۴۰۔ حضرت مالک بن الحویرثؓ اپنے قبیلہ کے لوگوں کے ساتھ تقریباً تین ہفتہ مدینہ میں مقیم رہے اور آپؐ کے دامنِ تربیت سے وابستہ ہوکر دین کی باتیں سیکھتے رہے۔ واپسی کے وقت آپؐ نے انھیں نماز کی تاکید کے ساتھ یہ نصیحت کی کہ انھوں نے جو کچھ دینی تعلیم حاصل کی ہے اس سے اپنے گھر کے لوگوں کو بھی روشناس کریں گے ۴۱۔ ملوکِ کندہ کا وفد مدینہ پہنچ کر مشرف باسلام ہوا اور کچھ عرصہ وہاں مقیم رہ کر حضرت سعد بن عبادہؓ سے دین کی تعلیم حاصل کرتا رہا۔ بنوتمیم کا وفد (جوستر (۷۰) سے زیادہ افراد پر مشتمل تھا) حضورﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کافی دنوں تک مقیم رہ کر دینی تعلیم سے فیض یاب ہوا۔ اسی طرح طائف کے وفد ثقیف، وفد غامد اور وفد خولان کے مدینہ آنے پر آپؐ نے ان کے لیے قرآن و سنت کی تعلیم کا اہتمام فرمایا ۴۲۔ یہاں یہ بھی واضح رہے کہ مختلف مقامات سے علم دین کی طلب میں مدینہ آنے والوں کے اعزاز وکرام میں صحابہ کو مخاطب کرتے ہوئے نبی کریمﷺ نے فرمایا تھا کہ ''دور دراز علاقوں سے لوگ علم حاصل کرنے کے لیے تمھارے پاس آئیں گے۔ جب وہ آئیں تو تم ان کے ساتھ خیر کا معاملہ کرنا'' ۴۳۔ اسی ضمن میں یہ ذکر بھی بے موقع نہ ہوگا کہ جب بھی کوئی مسلمان ہجرت کرکے مدینہ کا قصد کرتا تو نبی کریمﷺ اس کی دینی تعلیم پر خصوصی توجہ دیتے اور کسی صحابی کو اس خدمت پر مامور فرماتے۔ حضرت عبادہ بن صامتؓ کی ایک روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان نووارد دین کو سب سے پہلے قرآن کی تعلیم دی جاتی تھی ۴۴۔

بیرونی علاقوں میں معلمین کا تقرر

تعلیم کی اشاعت میں نبی کریمﷺ کی مثالی خدمات کا پانچواں اہم پہلو دارالاسلام کے باہر مختلف علاقوں اور قبائل میں تعلیم کا اہتمام اور اس مشن پر معلمین کی تقرری ہے۔ سب سے پہلے صحابی، جنھیں نبی کریمﷺ نے مکے کے باہر معلم کی حیثیت سے مقرر فرمایا، حضرت مصعب بن عمیرؓ تھے۔ انھیں بیعت عقبہ اولیٰ کے بعد مدینہ کے نومسلموں کی درخواست پر مدینہ بھیجا گیا تھا، تاکہ وہ انھیں قرآن کریم کی تعلیم دیں اور دین کی باتیں سکھائیں ۴۵۔ بعد میں

حضرت عبداللہ بن امّ مکتومؓ بھی اس کام پر مامور ہوئے۔ ان حضرات نے نہ صرف یہ کہ دینی تعلیم سے لوگوں کو بہرہ ور کیا، بلکہ اسلام کی تبلیغ کی خدمت بھی انجام دی، جس کے بڑے خوش گوار نتائج برآمد ہوئے۔ ان کا قیام حضرت اسعد بن زرارہؓ کے مکان پر تھا، جس کی حیثیت مدینہ کے اولین تعلیمی و تبلیغی مرکز کی ہوگئی تھی۔ خاص بات یہ کہ وہ انصار کے گھروں میں جاجا کر تعلیم دیتے تھے۴۶۔ اس سے اس عہد مسعود میں عام لوگوں میں تعلیم کی ترویج کا ایک مزید ثبوت ملتا ہے۔ جدیلہ کے کچھ مسلمان مدینہ آئے اور نبی کریم ﷺ سے درخواست کی کہ ان کے یہاں ایسے لوگ بھیجے جائیں جو انھیں قرآن پڑھائیں اور دین کے مسائل سکھائیں۔ آپؐ نے چھ صحابہ کی ایک جماعت ان کے ساتھ روانہ فرمائی، جس کے امیر حضرت مرثد بن ابی مرثدؓ تھے۴۷۔ اسی طرح یمن کے کچھ لوگ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دین کی تعلیم اور قرآن کے مطابق فیصلہ کرنے کے لیے کسی کو بھیجنے کی درخواست کی۔ آپؐ نے ان امور کی انجام دہی کے لیے حضرت علیؓ کو مامور فرمایا۴۸۔ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی روایت کے مطابق نبی کریم ﷺ نے انھیں اور حضرت معاذ بن جبلؓ کو قرآن مجید کی تعلیم کے لیے یمن بھیجا تھا۴۹۔ یہ واقعہ تو بہت مشہور ہے کہ نجد کے بعض قبائل کی فرمائش پر آپؐ نے وہاں قرآن کی تعلیم اور اسلام کی دعوت کے لیے ستّر (۷۰) قراء (قرآن کے عالم) بھیجے تھے، لیکن ان لوگوں نے بدعہدی اور غدّاری کرکے ان تمام کو بیرمعونہ کے پاس شہید کردیا۵۰۔ ہجرت کے بعد بھی حضور اکرم ﷺ نے مکہ کے مسلمانوں کی تعلیم کا اہتمام باقی رکھا۔ حضرت معاذ بن جبلؓ کو وہاں خاص طور سے لوگوں کو قرآن کی تعلیم دینے کی خدمت سپرد کی تھی۵۱۔

نبی کریم ﷺ نے نہ صرف یہ کہ مختلف علاقوں میں لوگوں کی تعلیم و تربیت کے لیے اپنے معلّم مقرر فرمائے، بلکہ دوٗر دراز علاقوں میں تعلیمی نظام کی دیکھ بھال کے لیے نگراں یا ناظرِ تعلیمات متعین کیے۔ اس کام کے لیے آپ بسااوقات صوبہ کے گورنروں کو مامور فرماتے تھے۔ کم ازکم یمن کے گورنر حضرت عمرو بن حزمؓ کے بارے میں اس کا ثبوت ملتا ہے۔ انھیں جو تقرر نامہ دیا گیا تھا اس میں دیگر ہدایات کے ساتھ یہ بھی درج تھا کہ وہ وہاں کے لوگوں کو خیر کی بشارت دیں، اچھے کاموں کی تلقین کریں، قرآن کی تعلیم دیں اور اس کی سمجھ ان میں پیدا

کریں۵۲۔ بقول ممتاز محقق ڈاکٹر حمید اللہ مرحوم ''کوئی تعجب نہیں کہ دیگر صوبہ جات میں بھی اس طرح کے افسر مامور کیے گئے ہوں'' ۵۳۔

تدریسی مضامین

جہاں تک عہد نبویؐ کے نظام تعلیم کے تحت پڑھائے جانے والے مضامین کا تعلق ہے، بلا شبہ ان میں قرآن و حدیث کو اولیت حاصل تھی۔ انفرادی و اجتماعی تعلیم کے نظام یا تعلیم دینے کے جتنے واقعات اس دور سے متعلق ملتے ہیں ان میں قرآن کی تعلیم کا ذکر جز و لازم کے طور پر ہوتا ہے اور یہ بات مردوں، عورتوں، بچوں اور غلاموں سب کی تعلیم کے ضمن میں قدر مشترک تھی۔ مساجد میں تعلیم کا جو نظام جاری ہوا اس میں قرآن کی تعلیم پر خاص توجہ دی جاتی تھی۔ صحابہ کے مذاکراتی حلقوں میں قرآن کے سمجھنے سمجھانے پر خاص زور دیا جاتا تھا۔ انفرادی درس گاہوں میں سب سے پہلے قرآن پڑھایا جاتا تھا۔ ہجرت سے قبل مدینہ میں اور ہجرت کے بعد بیرونی علاقوں میں جو معلمین بھیجے گئے وہ قاری یا مقری یعنی قرآن کے ماہر ہوتے تھے۔ وہ سب سے پہلے قرآن کی تعلیم دیتے تھے۔ علم دین کی طلب میں دوسرے علاقوں سے آنے والے وفود کو سب سے پہلے قرآن کی تعلیم دی جاتی تھی۔ متعدد روایتوں میں عام تعلیم کے ضمن میں قرآن کے ساتھ حدیث کی تعلیم کا بھی ذکر ملتا ہے۔ وفد عبدالقیس کے لوگوں نے مدینہ میں اپنے قیام کے تجربات بیان کرتے ہوئے ذکر کیا کہ انصار ہمیں قرآن کریم اور سنت رسول ﷺ کی تعلیم دیتے تھے۵۴۔ نجران کے قبیلہ بنو حارث بن کعب کے اسلام لانے کے بعد حضرت خالد بن ولیدؓ نے وہاں قیام کر کے انھیں دین کی تعلیم دی۔ اس میں خاص طور سے اسلام، شرائعِ اسلام اور قرآن و سنت کی تعلیم کا ذکر ملتا ہے۵۵۔ بچوں کی تعلیم کے سلسلہ میں قرآن پڑھانے کے علاوہ ایک اور چیز کا تذکرہ ملتا ہے، وہ ہے لکھنے کی مشق کرانا۔ مختلف مساجد میں ابتدائی تعلیم کا جو نظام رائج تھا اس کے تحت اس کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا۵۶۔ بعض احادیث سے بچوں کو نشانہ بازی اور پیراکی سکھانے کی بھی ترغیب ملتی ہے۵۷۔

فنِ کتابت کی تعلیم

اس زمانہ کی عام تعلیم میں قرآن مجید، حدیث اور دین کے ضروری احکام کا علم بہم

پہنچانے کے علاوہ وقت کی ضرورت اور مستقل افادیت کے نقطۂ نظر سے جس فن کے سکھانے کا سب سے زیادہ اہتمام کیا جاتا تھا وہ کتابت کا فن تھا۔ یہ بات عام طور پر مشہور ہے کہ بعثت کے وقت مکہ میں ان لوگوں کی تعداد بیس سے بھی کم تھی جو لکھنا جانتے تھے۔ انفرادی ضرورت کے علاوہ اجتماعی امور کی انجام دہی (معاہدات، خطوط، سرکاری احکام و ہدایات لکھوانا اور مختلف چیزوں کا ریکارڈ تیار کرنا وغیرہ) کے لیے ایسے مسلمانوں کی ضرورت بڑھتی جارہی تھی جو لکھنے کے اہل ہوں۔ دوسرے یہ بات بھی اپنی جگہ مسلّم ہے کہ خود علم کے تحفظ اور اس کی اشاعت کا ایک بہت بڑا ذریعہ تحریر ہے۔ ایک صحابی نے حافظہ کی کم زوری کی وجہ سے سنی یا سیکھی ہوئی باتوں کو یاد نہ رکھ پانے کا شکوہ کیا تو آپؐ نے انھیں ہدایت دی کہ اپنے دائیں ہاتھ سے مدد لو۵۸۔ نازل شدہ قرآنی آیات اور احادیث نبویؐ کو تحریری صورت میں محفوظ رکھنے اور قرآنی ہدایت کے مطابق مالی معاملات کو ضبطِ تحریر میں لانے کے لیے بھی کاتبین کی ضرورت دن بہ دن بڑھتی جارہی تھی۔ آپؐ کی نظر میں وقت کی ضرورت کے تحت فن کتابت کی اہمیت و افادیت کا اندازہ اسیران بدر کے واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان میں جو رہائی کے لیے فدیہ کی رقم ادا کرنے سے قاصر تھے ان کا فدیہ آپؐ نے یہ قرار دیا کہ وہ انصار کے دس دس بچوں (غلمان) کو لکھنا سکھا دیں۔ خاص بات یہ کہ طبقاتِ ابن سعد میں مدینہ کے لوگوں میں اس فن سے واقف لوگوں کی ضرورت کی طرف یہ کہہ کر اشارہ بھی کردیا گیا ہے کہ مکہ کے لوگ لکھنا جانتے ہیں، جب کہ مدینہ کے لوگ نہیں جانتے ۵۹۔ ان قیدیوں سے کتابت سیکھنے والوں میں حضرت زید بن ثابتؓ بھی تھے، جو کاتبین وحی میں سب سے زیادہ مشہور ہوئے۔

جو صحابہ کرامؓ دیگر حضرات کو کتابت سکھانے کی خدمت انجام دیتے تھے ان میں حضرت عبادہ بن صامتؓ، حضرت عبداللہ بن سعید بن العاصؓ، حضرت سعد بن عبادہؓ، حضرت زید بن ثابتؓ اور حضرت ابورافع مولیٰ حضرت عبداللہ بن عمرؓ معروف ہیں۔ صحابیات میں حضرت شفاء بنت عبداللہؓ اور حضرت ام درداءؓ اس فن کی ماہر تھیں اور وہ دوسروں کو لکھنا سکھاتی تھیں۔

عہد نبویؐ کی تعلیمی سرگرمیوں میں کتابت (یا لکھنا) کے سیکھنے سکھانے کا جو اہتمام پایا جاتا تھا اس سے واضح طور پر وقت کے تقاضے کے مطابق علم کی حفاظت، اشاعت و ترقی کے

ذرائع اختیار کرنے کی ترغیب وتشویق ملتی ہے۔ موجودہ دور میں علوم وفنون کو محفوظ رکھنے اور دوسروں تک منتقل کرنے کے لیے کمپیوٹر، انٹرنیٹ، ای میل کا استعمال عام ہوتا جارہا ہے۔ وسیع پیمانہ پر معلومات بہم پہونچانے کے لیے دوسرے جدید ذرائع ابلاغ بھی اختیار کیے جاتے ہیں۔علم کی حفاظت واشاعت کے لیے بنیادی طور پر کتابت کی اہمیت وافادیت اپنی جگہ مسلم ہے، لیکن آج کے دور میں اس کے جو متبادل ذرائع رائج ہوگئے ہیں، ضروری ومفید کاموں کے لیے ان کے استعمال کا طریقہ سیکھنے کی ضرورت واہمیت سے کون انکار کرسکتا ہے۔

مختلف زبانیں سیکھنے کا اہتمام

تعلیم کے میدان میں نبی کریم ﷺ کے اسوۂ مبارکہ سے ہمیں یہ سبق بھی ملتا ہے کہ انفرادی واجتماعی ضروریات کی تکمیل کے لیے ہمیں مختلف زبانیں سیکھنی چاہیے۔ یہ بات مستند روایتوں سے ثابت ہے کہ ضرورت کے تحت آپؐ نے صحابہ کو سریانی یا عبرانی زبان سیکھنے کی ترغیب دی۔ سب سے پہلے حضرت زید بن ثابتؓ کو باقاعدہ اس کی ہدایت فرمائی اور انھوں نے نہایت مختصر عرصہ میں اس زبان کو پڑھنا اور لکھنا سیکھ لیا، جیسا کہ خود انھوں نے اس واقعہ کو بیان کیا ہے۶۰۔ اس سلسلہ میں مختلف روایتوں میں حضرت زید بن ثابتؓ کو یہ زبان سیکھنے کی جو وجوہ آپؐ کی زبانی بیان کی گئی ہیں وہ یہ ہیں: ''میرے پاس بعض ایسے خطوط آتے ہیں کہ مجھے پسند نہیں کہ دوسرا اسے پڑھے، مجھے خطوط پڑھوانے کے معاملہ میں یہودیوں پر اطمینان نہیں رہتا۔ میں خطوط لکھواتا ہوں اور مجھے اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں وہ اس میں کوئی تبدیلی نہ کردیں ۶۱۔ یہ زبان سیکھ کر حضرت زید بن ثابتؓ نے کس طرح اس ضرورت کی تکمیل کردی اسے وہ خود بیان کرتے ہیں کہ ''میں اس لائق ہوگیا تھا کہ موصولہ خطوط کا ترجمہ نبی کریم ﷺ کو پڑھ کر سناؤں اور آپؐ کی جانب سے خطوط لکھ کر یہود کو بھیجوں''۶۲۔ بعض مورخین کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت زید بن ثابتؓ عبرانی کے علاوہ قبطی، فارسی، رومی اور حبشی زبانوں سے بھی بخوبی واقف تھے اور یہ زبانیں انھوں نے ان غیر ملکیوں سے سیکھی تھی جو مختلف کاموں سے مدینہ آتے تھے۶۳۔ ان کے علاوہ حضرت عمر الفاروقؓ، حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ اور حضرت حنظلہ

بن الربیعؓ نے بھی عبرانی زبان سیکھی تھی ۔ موخر الذکر حضرت زید بن ثابتؓ کی غیر موجودگی میں مکاتیب نبویؐ کی کتابت کی خدمت انجام دیتے تھے۶۴۔ حضرت ابو ہریرہؓ کے بارے میں یہ شہادت ملتی ہے کہ وہ فارسی زبان سے اس حد تک واقف تھے کہ اس میں بات چیت کر لیتے تھے۶۵۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے بارے میں یہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ متعدد زبانیں جانتے تھے۔ ان کے پاس مختلف اقوام کے غلام تھے اور وہ ان سے انہی کی زبان میں گفتگو کرتے تھے۶۶۔ ظاہر ہے کہ انھوں نے یہ زبانیں انہی غلاموں یا غیر عرب لوگوں سے سیکھی ہوں گی۔ ان تمام روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ عہد نبویؐ میں صحابہ کرام ضرورت کے تحت غیر عربی زبانیں سیکھتے تھے اور نبی کریم ﷺ اس کی ترغیب دیتے تھے۔

واقعہ یہ کہ بہت سی انفرادی و اجتماعی ضروریات کی تکمیل کے لیے مختلف زبانوں سے واقفیت ضروری ہے۔ موجودہ دور میں اسلامی عقاید و تعلیمات کی تشریح و ترجمانی، دینی علوم کا ارتقاء اور اسلام کی اشاعت کے لیے عربی، فارسی، اردو کے علاوہ انگریزی، دوسری یوروپین اور برصغیر کی مختلف علاقائی زبانوں سے واقفیت کی افادیت کافی بڑھ گئی ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے ایک خاص اجتماعی ضرورت کے تحت عبرانی زبان سیکھنے پر زور دیا تو آج کے ماحول میں مختلف ملی ضروریات کی تکمیل کے لیے جدید مروجہ زبانوں میں مہارت حاصل کرنے کے معاملہ میں اس اسوۂ مبارکہ سے روشنی حاصل کرنی چاہیے۔

دیگر علوم کے اکتساب کی ترغیب

فن کتابت اور عبرانی زبان کے علاوہ بعض دیگر مفید علوم کے اکتساب کی ترغیب بھی عہد نبویؐ میں ملتی ہے۔ ان میں علم انساب، علم میراث، علم نجوم اور تیر اندازی شامل ہیں۔ ان میں سے بعض علوم کی افادیت بھی بیان کی گئی ہے۔ علم انساب کی طرف توجہ دلاتے ہوئے آپؐ نے فرمایا کہ ''اس سے تم آپس میں رشتے جوڑتے ہو یا (دوسری روایت کے مطابق) اس سے تمھارے درمیان محبت بڑھے گی۶۷۔ ظاہر ہے کہ علم میراث سے ترکہ کی تقسیم کے حساب و کتاب میں آسانی ہوتی ہے۔ اس کے لیے علم ریاضی میں مہارت درکار ہوتی ہے۔ علم نجوم کے

بارے میں ارشاد ہوا کہ ''اس کے ذریعہ برّ و بحر میں راستہ معلوم کرنے میں آسانی ہوتی ہے'' ۶۸۔ تیراندازی کا تعلق دفاعی تیاری اور مخالفین کے حملہ سے حفاظت کے اہتمام سے ہے۔ اسے سیکھنے کا بھی آپؐ نے حکم فرمایا ۶۹۔

فنّی اختصاص

عہد نبویؐ کی تعلیمی سرگرمیوں کے سلسلہ میں ایک اور اہم بات کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ کسی فن میں اختصاص یا (Specialization) حاصل کرنے کی داغ بیل اس عہد مبارک میں پڑ چکی تھی۔ اس کا ثبوت اس سے فراہم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام میں مختلف علوم کے ماہرین دستیاب تھے اور نبی کریم ﷺ ان کی نشان دہی فرما کر ان سے استفادہ کرنے کی ہدایت دیتے تھے، مثلاً صحیح بخاری کی روایت کے مطابق آپؐ نے فرمایا کہ ''جسے قرآنی علوم حاصل کرنے ہوں وہ ان چار حضرات سے رجوع کریں: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ اور حضرت سالم مولیٰ ابوحذیفہؓ'' ۷۰۔ اسی طرح ایک دوسری روایت میں آپؐ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ ''حضرت زید بن ثابتؓ علم میراث، حضرت ابی بن کعبؓ تجوید و قراءت اور حضرت معاذ بن جبلؓ حلال و حرام کے احکام کے ماہر ہیں'' ۷۱۔ علم انساب کے ماہرین میں حضرت ابوبکرؓ کا ذکر ملتا ہے۔ آپؐ نے ایک بار حضرت حسان بن ثابتؓ سے فرمایا تھا کہ اگر ''انھیں قریش کے نسب کے بارے میں معلومات درکار ہوں تو وہ اس کے لیے حضرت ابوبکرؓ سے رجوع کریں'' ۷۲۔

اُس زمانہ میں اہل عرب میں فنی اختصاص کے ارتقاء کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ مختلف علوم کے ماہرین کے لیے مخصوص القاب مستعمل تھے۔ قرآن کریم کے ماہر قاری یا مقری کہلاتے تھے، حضرت مصعب بن عمیرؓ مقری کے لقب سے مشہور ہوئے ۷۳۔ کتابت میں مہارت رکھنے والے 'الکاتب' کہلاتے تھے، حضرت عبداللہ بن سعید بن عاصؓ کے لیے یہ لقب استعمال ہوا ہے ۷۴۔ 'الکامل' اس شخص کو کہا جاتا تھا جو کاتب ہونے کے ساتھ تیراندازی و پیراکی میں بھی مہارت رکھتا ہو۔ حضرت سعد بن عبادہؓ اور حضرت رافع بن مالک زرقیؓ کا شمار کاملین

میں ہوتا تھا۵؎۔ 'علامہ' کی اصطلاح کی نسبت سے ایک دلچسپ روایت یہ بیان کی جاتی ہے کہ ایک دفعہ حضور اکرم ﷺ مسجد نبوی میں تشریف لے گئے۔ وہاں دیکھا کہ لوگ ایک شخص کے پاس جمع ہیں۔ دریافت فرمایا کہ کیا بات ہے؟ صحابہ نے جواب دیا کہ ایک علامہ شخص آیا ہے۔ آپؐ نے پوچھا کہ اس سے کیا مراد ہے؟ صحابہ نے واضح کیا کہ یہ شخص ایام عرب، عربیت، اشعار اور انساب کا عالم ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ یہ علم مضر نہیں ہے۶؎۔

اس میں شبہ نہیں کہ جدید دور میں فنی اختصاص کی طلب کافی بڑھ گئی ہے اور اس کے حصول کا طریقہ کافی ترقی کر گیا ہے، لیکن اس طریقۂ تعلیم کو جدید دور کی دین کہنا صحیح نہ ہوگا۔ اسلامی تاریخ کے اولین دور میں اس کے نشو ونما کی مثالیں ملتی ہیں، جیسا کہ عہد نبویؐ کی تعلیمی سرگرمیوں کے واقعات شاہد ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس باب میں عہد زریں کے رہ نما خطوط کو پیش نظر رکھا جائے اور اس طریقۂ تعلیم کو مزید مستحکم کیا جائے۔ جدید دور کے مطالبات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ملت میں مختلف علوم وفنون کے ماہرین پیدا ہوں، جو اسلام کی موثر ترجمانی اور ملی فلاح و بہبود کے مختلف کام بحسن وخوبی انجام دے سکیں۔

تعلیم کا مذاکراتی طریقہ

نبی کریم ﷺ کے عہد مبارک میں تعلیم کا ایک اور طریقہ رائج تھا۔ اسے مذاکراتی یا حلقہ جاتی طریقہ کہا جا سکتا ہے۔ صحابۂ کرام مسجد نبویؐ میں حلقہ بنا کر بیٹھ جاتے اور انھوں نے نبی کریم ﷺ سے قرآن وحدیث کی جو تعلیم حاصل کی اس کا مذاکرہ کرتے اور ایک دوسرے کی معلومات سے فائدہ اٹھاتے۔ بعض دفعہ ایک شخص مجلس میں قرآنی آیات یا احادیث پڑھ کر سناتا اور دوسرے بہ غور سنتے۔ اس طرح وہ اپنے علم کو تازہ بہ تازہ کرتے رہتے تھے۔ یہ حلقۂ تعلیم مسجد نبوی میں مسلسل جاری رہتا۔ ایک حلقہ اپنا مذاکرہ موقوف کر دیتا تو دوسرا یہ سلسلہ شروع کر دیتا۔ بعض اوقات مذاکرے کی ایک ساتھ کئی کئی مجلسیں جاری رہتیں۔ قرآن وحدیث کے علم کے فروغ کے لیے یہ منہج درس بہت مفید ثابت ہوتا تھا۔ نبی کریم ﷺ اس طرح کی مجالسِ مذاکرہ کو پسند کرتے تھے اور بعض اوقات ان میں شریک ہو کر شرکاء مجلس کی حوصلہ افزائی فرماتے تھے۔

ایک روایت میں حضرت رافع بن خدیجؓ بیان کرتے ہیں کہ ہم لوگ مسجد نبوی میں ایک مجلس میں بیٹھے حدیث کا مذاکرہ کررہے تھے، اسی دوران حضور اکرم ﷺ تشریف لائے اور دریافت کیا: تم لوگ کیا کررہے ہو؟ ہم نے عرض کیا: جو کچھ آپ سے سنا ہے اسی کا مذاکرہ کررہے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: بہتر ہے کہ تم حدیث یاد کرکے دوسروں سے بیان کیا کروے۔ اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس طرح کی مجالس سے مقصود نبی کریم ﷺ سے سنی ہوئی احادیث کا مراجعہ و مذاکرہ ہوتا تھا، تاکہ وہ یاد رہیں اور دوسروں سے انھیں بیان کرنے میں آسانی ہو۔

رسول اللہ ﷺ کا طریقۂ تعلیم وتربیت

تعلیم وتربیت کے لیے معلم انسانیت ﷺ نے جو منہج اختیار کیا وہ بھی بہت اہمیت رکھتا ہے۔ آپؐ کی تعلیم وتربیت کا سلسلہ اٹھتے، بیٹھتے، چلتے پھرتے، مسجد ومسکن مبارک، صحابہ کے مکانات اور ازواجِ مطہرات کے حجرات، سفر وحضر، ہر وقت اور ہر جگہ جاری رہتا تھا، لیکن عام تعلیم وتذکیر کے لیے آپؐ نے بعض اوقات خاص کررکھے تھے، تاکہ لوگ باخبر رہیں اور زیادہ سے زیادہ آپ سے مستفیض ہوسکیں۔ بالعموم نماز فجر کے بعد آپؐ کے درس وارشاد کا فیض جاری رہتا تھا، لیکن بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر نماز کے بعد آپؐ کچھ دیر مسجد میں قیام فرماتے اور تعلیم وتذکیر کی مجلس منعقد ہوجاتی۔ عورتوں کی تعلیم کے لیے آپ کے مقررہ دن کی روایت بہت مشہور ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم کے لیے کچھ اوقات متعین رہیں تو شایقین علم کو استفادہ میں آسانی ہوگی اور زیادہ سے زیادہ لوگ فیض یاب ہوسکیں گے۔

نبی کریم ﷺ نہایت سکون واطمینان کے ساتھ تعلیم دیتے تھے۔ آپؐ ایسی سادہ زبان اور آسان اسلوب اختیار کرتے کہ بدوی وشہری، ان پڑھ اور پڑھے لکھے، بچے، جوان اور بوڑھے سب آپ کے ارشادات کو سمجھ لیتے۔ آپؐ ہر بات کو تین بار دہراتے، تاکہ حاضرین اچھی طرح سن لیں اور سمجھ کر ذہن نشین کرلیں۸ے۔ باتوں کو مثالوں سے سمجھانا آپؐ کا پسندیدہ طریقۂ تعلیم رہا ہے۔ خاص طور سے اہم باتوں کی تعلیم دیتے وقت آپؐ مثالیں پیش کرتے، تاکہ زیر بحث نکتہ بآسانی سمجھ میں آجائے اور سامعین کے دل ودماغ میں نقش ہوجائے۔ اس

سے متعلق بے شمار روایتیں کتب احادیث میں محفوظ ہیں۔ مثلاً ایک موقع پر اہل ایمان میں باہمی اتحاد و اتفاق اور محبت و ہمدردی کی اہمیت واضح کرنے کے لیے آپؐ نے یہ مثال بیان فرمائی کہ ایک مومن دوسرے مومن کے لیے عمارت کے مثل ہے، جس کا ایک حصہ دوسرے کو مضبوطی دیتا ہے، پھر آپؐ نے اپنی انگلیوں کو ملا کر دکھایا۷۹۔ موجودہ دور میں پڑھاتے ہوئے مثالوں کے ذریعہ باتوں کو واضح کرنا اور طلبہ کو سمجھانا معمول بہ بن چکا ہے۔

تعلیم دیتے وقت آپؐ سوال و جواب کے ذریعہ بھی افہام و تفہیم کا طریقہ اختیار فرماتے تھے۔ آپؐ صحابۂ کرام کو سوال کی ترغیب دیتے تھے۔ ایک مجلس میں آپؐ نے فرمایا کہ ''تم میں سے کسی کو کسی معاملہ یا بات میں کوئی اشکال ہو تو مجھ سے پوچھ لیا کرے''۸۰۔ صحابۂ کرام بلا تکلف آپؐ سے سوالات کر لیتے تھے۔ حضرت زیاد بن لبیدؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ نبی کریم ﷺ نے ایک فتنہ (یا خوف ناک چیز) کا ذکر کیا اور فرمایا کہ ایسا اس وقت ہوگا کہ علم دین مٹ جائے گا۔ اس پر میں نے دریافت کیا کہ علم دین کیوں کر مٹ جائے گا؟ جب کہ ہم قرآن پڑھتے ہیں اور اپنے بچوں کو پڑھاتے ہیں اور پھر ہماری اولاد اپنی اولاد کو پڑھائے گی (اور یہ سلسلہ چلتا رہے گا) یہ سن کر آپؐ نے فرمایا: ''اے زیاد، میں تمھیں مدینہ والوں میں سب سے زیادہ سوجھ بوجھ والا سمجھتا تھا۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ یہود و نصاریٰ تورات و انجیل کی کتنی تلاوت کرتے ہیں، لیکن ان کی تعلیمات پر کچھ بھی عمل نہیں کرتے''۸۱۔ اگر کوئی شخص کسی بات کو سمجھنے کے لیے اس سے متعلق سوال در سوال کرتا تو آپ ناراضی ظاہر کیے بغیر اس کے جوابات عنایت فرماتے تھے۔ مثال کے طور پر حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ہر مسلمان پر صدقہ ادا کرنا واجب ہے۔ دریافت کیا گیا کہ اگر اس کے پاس صدقہ کے لیے کچھ نہ ہو تو وہ کیا کرے؟ آپؐ نے فرمایا: کام کرے، اپنے کو نفع پہنچائے اور اسی کمائی سے صدقہ بھی کرے۔ سوال کرنے والے نے پھر معلوم کیا کہ اگر اس کے پاس اس کی بھی طاقت نہ ہو؟ آپؐ نے فرمایا: کسی پریشان حال حاجت مند کی مدد کرے۔ پوچھا گیا: اگر وہ یہ بھی نہ کر سکے؟ آپؐ نے فرمایا: اچھی باتوں کا حکم دے۔ پھر سوال کیا گیا: اگر اس سے یہ بھی نہ ہو سکے؟ آپؐ نے فرمایا: برائی سے بچا رہے۔ (یعنی دوسروں کو نقصان پہنچانے سے باز

رہے) یہ بھی صدقہ ہے۸۲۔ ساتھ ہی روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ لایعنی اور غیرضروری سوالات کو ناپسند فرماتے تھے اور اس پر خفگی کا اظہار فرماتے تھے۸۳۔

بعض اوقات نبی کریم ﷺ کسی بات کی طرف خصوصی توجہ دلانے یا کسی دینی و اخلاقی تعلیم کی اہمیت واضح کرنے کے لیے صحابہ سے خود سوال فرمایا کرتے تھے۔ اس وقت صحابہ کبھی اپنی فہم کے مطابق جواب دیتے اور کبھی کہتے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ زیادہ بہتر جانتے ہیں۔ بعض دفعہ وہ غور وفکر کرتے اور پھر آپؐ سے جواب کے خواہاں ہوتے۔ ان کے مطالبے پر آپؐ انھیں اپنے جواب سے نوازتے۔ ایک دفعہ حقوق العباد کی اہمیت اجاگر کرنے کے لیے آپؐ نے پوچھا: جانتے ہو مفلس کون ہے؟ صحابہ نے جواب دیا: جس کے پاس کچھ بھی مال نہ ہو۔ آپؐ نے فرمایا: ''میری امت کا مفلس وہ ہے جو قیامت کے دن اللہ کے سامنے نماز، روزہ وزکوٰۃ کی نیکیوں کے ساتھ آئے گا، لیکن اسی کے ساتھ اس نے کسی کو گالی دی ہوگی، کسی پر بے جا الزام لگایا ہوگا، کسی کا مال چھینا ہوگا، کسی کا خون بہایا ہوگا اور کسی کو مارا پیٹا ہوگا۔ ایسے شخص کی ساری نیکیاں مظلوموں کے درمیان تقسیم کردی جائیں گی، یہاں تک کہ اس کی نیکیاں ختم ہوجائیں گی، مگر کچھ لوگوں کے حقوق باقی رہ جائیں گے تو باقی ماندہ مظلوموں کے گناہ اس شخص کے حساب میں جمع کردیے جائیں گے اور اسے جہنم میں جھونک دیا جائے گا''۸۴۔ ایک مرتبہ آپؐ نے سوال کیا: کیا تم جانتے ہو کہ غیبت کیا ہے؟ صحابہ نے جواب دیا: اللہ اور اس کے رسول زیادہ جانتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: تمھارا اپنے بھائی کے بارے میں اس کے پیٹھ پیچھے ایسی بات کہنا جس کو وہ ناپسند کرے، یہ غیبت ہے۔ صحابہ نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! اگر وہ چیز اس میں ہو؟ آپؐ نے فرمایا: یہی تو غیبت ہے، اگر اس میں وہ چیز نہیں ہے تو وہ بہتان ہے۸۵۔

اوپر کی تفصیلات سے رسول اللہ ﷺ کی تعلیم سے دل چسپی، اس کے فروغ کی کوشش، اس کے نظام تعلیم، انواع تعلیم، مراکز تعلیم، طریقۂ تعلیم، مضامین درس اور منہج تدریس اور دور حاضر میں مختلف پہلوؤں سے اس کی معنویت واضح ہوتی ہے۔

حواشی و مراجع

۱ جامع ترمذی، ابواب العلم، باب ماجاء فی فضل الفقه علی العبادة (الکلمة الحکمة ضآلّة المومن فحیث وجدها فهو احق بها) علامہ البانی نے اسے ضعیف جداً قرار دیا ہے۔

۲ علی بن ابی بکر الہیثمی، مجمع الزوائد ومنبع الفوائد، مطبع الانصار، دہلی ۱۳۰۸ھ، ص ۴۸

۳ سنن ابن ماجه، کتاب السنة (مقدمه)، باب فضل العلماء والحث علی طلب العلم

۴ سنن ابن ماجه، باب فضل العلماء والحث علی طلب العلم، (طلب العلم فریضة علی کلم مسلم)

۵ جامع ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ما جاء فی ادب الولد (علامہ البانی نے اسے ضعیف قرار دیا ہے)

۶ صحیح بخاری، کتاب العلم، باب تعلیم الرجل امته و اهله

۷ مجمع الزوائد، محولہ بالا، ص ۷، علامہ شبلی نعمانی، سیرۃ النبیؐ، معارف پریس، اعظم گڑھ، ۲۰۰۳ء، ۲/۱۷۸-۱۷۹

۸ محمد عبدالمعبود، عہدِ نبویؐ میں نظامِ تعلیم، فرید بک ڈپو، نئی دہلی، ۲۰۰۴ء، ص ۳۸، ۷۹

۹ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، دار صادر، بیروت، ۱۹۶۰ء، ۱/۲۱۸

۱۰ صحیح بخاری، کتاب الصلوٰة، باب امامة العبد والمولی

۱۱ جامع بیان العلم و فضله، ص ۲۴۴

۱۲ سنن ابوداؤد، کتاب العلم، باب فی القصص (علامہ البانی نے اسے ضعیف قرار دیا ہے)

۱۳ علی بن حسام الدین المتقی، منتخب کنز العمال، داراحیاء التراث العربی، بیروت، ۱۹۹۰ء، ۳/۵۶۲

۱۴ مجمع الزوائد، ص ۶۵

۱۵ قاضی اطہر مبارک پوری، خیرالقرون کی درس گاہیں، شیخ الہند اکیڈمی دیوبند، ۱۹۹۶ء، ص ۲۸-۳۰، ۱۴۶، ۲۱۴

۱۶ صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب مقدم النبی ﷺ و أصحابه المدینة

۱۷ خیرالقرون کی درس گاہیں، ص ۱۵۰-۱۵۱، عہدِ نبویؐ میں نظامِ تعلیم، ص ۱۱۶-۱۱۸

۱۸ مسند احمد بن حنبل، المطبعة المیمنیة، مصر، ۱۳۱۳ھ، ۶/۳۷، شمس الدین الذہبی، تذکرة الحفاظ، دائرة المعارف العثمانیة، حیدرآباد، ۱۹۵۵ء، ۱/۲۷-۲۸، سید سلیمان ندوی، سیرة عائشہؓ، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۶۸ء، ص ۱۷۲-۱۷۶، ۲۶۸-۲۷۷

۱۹ صحیح بخاری، کتاب العلم، باب التناوب فی العلم

۲۰ سنن ابوداؤد، کتاب الاجارة، باب کسب المعلم

۲۱ ابن الاثیر، اسد الغابة فی معرفة الصحابة، المطبعۃ الاسلامیۃ، طہران، ۱۲۸۳ھ، ۳/ ۱۷۵، ابن حجر العسقلانی، الاصابة فی تمییز الصحابة، مطبعۃ مصطفیٰ محمد، مصر، ۱۹۳۹ء، ۲/ ۲۷

۲۲ علامہ شبلی نعمانی، سیرۃ النبیؐ، ۲/ ۹۷، عہد نبویؐ میں نظام تعلیم، ص ۵۶

۲۳ عہد نبویؐ میں نظام تعلیم، ص ۳۸

۲۴ ڈاکٹر حمید اللہ، عہد نبویؐ کا نظام تعلیم، نقوش رسول نمبر (لاہور)، جنوری ۱۹۸۳ء، ۴/ ۱۲۵

۲۵ طبقات ابن سعد، دار صادر، بیروت، ۱۹۵۷ء، ۲/ ۲۲

۲۶ عبدالرؤف ظفر، اسوۂ کامل ﷺ، نشریات، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۵۰۱

۲۷ صحیح بخاری، کتاب العلم، باب الحیاء فی العلم

۲۸ یحییٰ بن شرف النووی، ریاض الصالحین، دار المامون للتراث، دمشق (بدون تاریخ)، ص ۱۷۵

۲۹ سنن ابن ماجه (مقدمه)، باب الایمان

۳۰ طبقات بن سعد، ۱/ ۳۲۳، خیر القرون کی درس گاہیں، ص ۵۳-۵۶

۳۱ مسند احمد بن حنبل، دار المعارف، مصر، ۱۹۴۹ء، ۱/ ۳۷۹، ۴۶۶

۳۲ طبقات ابن سعد، ۱/ ۳۳۶، خیر القرون کی درس گاہیں، ص ۵۵-۵۶

۳۳ مسند احمد بن حنبل، ۵/ ۱۸۶

۳۴ جامع ترمذی، ابواب البر و الصلة، باب ما جاء فی نفقة علی البنات، سنن ابن ماجة، ابواب الادب، باب بر الوالد والاحسان بالبنات، سنن ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی فضل من عال یتامی

۳۵ صحیح مسلم، کتاب المناقب، باب مناقب عائشة

۳۶ سنن ابی داؤد، کتاب الطب، باب فی الرقی

۳۷ صحیح بخاری، کتاب العلم، باب هل یجعل للنساء یوم علی حدة فی العلم، باب الحیاء فی العلم

۳۸ علامہ شبلی نعمانی، سیرۃ النبیؐ، ۲/ ۱۸۱-۱۸۲، خیر القرون کی درس گاہیں، ص ۶۱

۳۹ احمد بن یحییٰ البلاذری، فتوح البلدان، محولہ بالا، ص ۶۱-۲۶۲

۴۰ صحیح بخاری، کتاب العلم، باب تحریض النبی ﷺ وفد عبدالقیس علیٰ ان یحفظوا الایمان والعلم ویخبروا من ورائهم، مسند احمد بن حنبل، ۳/ ۴۳۲، ۴۳۶

۴۱ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب رحمة الناس والبهائم، سنن دارمی، کتاب الصلاة، باب من احق بالامامة

۴۲ ان وفود کے افراد کی تعلیم و تربیت اور ان کے قیام و طعام کی تفصیلات کے بارے میں دیکھیے: علامہ شبلی نعمانی، سیرۃ النبیؐ، ۲/ ۲۹-۴۲، خیر القرون کی درس گاہیں، ص ۹۳-۹۷

۴۳ جامع ترمذی، باب ماجاء فی الاستیصاء لمن یطلب العلم

۴۴ سنن ابوداؤد، کتاب الاجارۃ، باب کسب المعلم

۴۵ صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب مقدم النبی ﷺ و اصحابہ المدینۃ، ابن ہشام، سیرۃ النبیؐ، دارالفکر، القاہرۃ، ۱۹۳۷ء، ۲/ ۴۲، طبقات ابن سعد، ۱/ ۲۲۰، ۳/ ۱۱۷

۴۶ طبقات ابن سعد، ۳/ ۱۱۸

۴۷ المستدرک علی الصحیحین، ابو عبداللہ الحاکم، دائرۃ المعارف، حیدرآباد، ۱۳۴۱ھ

۴۸ عہد نبویؐ میں نظام تعلیم، ص ۶۱

۴۹ حوالہ مذکور، ص ۶۱

۵۰ علامہ شبلی نعمانی، سیرۃ النبیؐ، ۱/ ۴۲۸

۵۱ عہد نبویؐ میں نظام تعلیم، ص ۶۰، ۱۲۱

۵۲ ابن ہشام، سیرۃ النبیؐ، ۴/ ۲۶۵

۵۳ ڈاکٹر حمید اللہ، عہد نبویؐ کا نظام تعلیم، نقوش رسول نمبر، ۴/ ۱۲۶

۵۴ مسند احمد بن حنبل، ۳/ ۴۳۲

۵۵ طبقات ابن سعد، ۱/ ۳۳۹

۵۶ عبدالمعبود، عہد نبویؐ میں نظام تعلیم، ص ۹۷

۵۷ ڈاکٹر حمید اللہ، محولہ بالا، ۴/ ۱۲۵

۵۸ جامع ترمذی، ابواب العلم، باب فی الرخصۃ فی کتابۃ العلم

۵۹ طبقات ابن سعد، ۲/ ۲۲ (وکان اھل مکۃ یکتبون واھل المدینۃ لایکتبون)

۶۰ سنن ابوداؤد، کتاب العلم، باب روایۃ حدیث اھل الکتاب، مسند احمد بن حنبل، ۵/ ۱۸۶

۶۱ مسند احمد بن حنبل، ۵/ ۱۸۶، سید رشید احمد ارشد، عہد نبوی میں نظام تعلیم، نقوش رسول نمبر، ۴/ ۱۳۸

۶۲ سنن ابوداؤد، کتاب العلم، باب روایۃ حدیث اھل الکتاب، مسند احمد بن حنبل، ۵/ ۱۸۶

۶۳ علی بن حسین المسعودی، التنبیہ والاشراف، مکتبہ خیاط، بیروت، ۱۹۶۵ء، ص ۲۸۳

۶۴ حوالہ مذکور، ص ۲۸۳

۶۵ الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ، ۴/ ۲۰۷، شاہ معین الدین ندوی، مہاجرین، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۵۲ء، ۲/ ۶۱

۶۶ مستدرک حاکم، ۳/۵۴۹

۶۷ جامع ترمذی، ابواب البر و الصلة، باب ماجاء فی تعلیم النسب، مستدرک حاکم، ۱/۸۹، ۱۶۱

۶۸ عہد نبویؐ میں نظام تعلیم، ص۳۱-۳۲، بحوالہ امام سیوطی، جمع الجوامع، ۱/۴۷۵

۶۹ حوالہ مذکور، ص۳۲ بحوالہ جمع الجوامع، ۱/۴۷۵ (تعلّموا الرمی والقرآن)

۷۰ صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب مناقب عبدالله بن مسعودؓ، صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل عبدالله بن مسعودؓ

۷۱ ابن عساکر، التاریخ الکبیر، مطبعۃ روضۃ الشام، ۱۳۳۲ھ، ۵/۴۴۵،

۷۲ صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب فضائل حسان بن ثابتؓ، عبدالکریم بن محمد السمعانی، الانساب، دائرہ المعارف العثمانیۃ، حیدرآباد، ۱۹۶۲ء، ۱/۸-۹

۷۳ سنن ابوداؤد، کتاب العلم، باب فی القصص، سیرة ابن هشام، ۲/۴۲

۷۴ اسدالغابة فی معرفة الصحابة، ۳/۱۷۵

۷۵ الاصابة فی تمییز الصحابة، ۲/۲۷

۷۶ السمعانی، الانساب، ۱/۹

۷۷ خیرالقرون کی درس گاہیں، ص۳۷

۷۸ صحیح بخاری، کتاب العلم، باب من اعاد الحدیث ثلاثا لیفهم، سنن ابوداؤد، کتاب العلم، باب تکریر الحدیث

۷۹ جامع ترمذی، باب ماجاء فی شفقة المسلم

۸۰ خیرالقرون کی درس گاہیں، ص۶۶ بحوالہ محمد بن محمد، جمع الفوائد، ۱/۴۸

۸۱ جامع ترمذی، ابواب العلم، باب فی ذهاب العلم، سنن ابن ماجه، ابواب الفتن، باب ذهاب القرآن والعلم

۸۲ امام بخاری، الادب المفرد، المطبعۃ السلفیۃ، القاہرۃ، ۱۳۸۷ھ، ۱/۳۱۶-۳۱۷، ۴۰۴-۴۰۵

۸۳ صحیح بخاری، کتاب العلم، باب الغضب فی الموعظة والتعلیم اذا رأی مایکره

۸۴ صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب تحریم الظلم

۸۵ صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب تحریم الغیبة، سنن ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی الغیبة

☆☆☆

موجودہ دور میں سیرت نگاری کے عمومی رجحانات
(دعوتِ اسلامی کے حوالے سے)

ڈاکٹر وارث مظہری

سیرتِ نبوی کے موضوع پر ہر دور میں کثرت سے کتابیں لکھی جاتی رہی ہیں۔ اسلامی کتب خانے مختلف زبانوں میں سیرت پر لکھی گئی کتابوں سے پر ہیں۔ اس موضوع کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس پر لکھنے والوں میں ہر جماعت، فرقے اور طبقے کے لوگ شامل ہیں، جن کا اپنا ذوق اور اپنے رجحانات و میلانات ہیں۔ جزوی یا کلی سطح پر ان کے مقاصد میں بھی اختلاف رہا ہے اور بسا اوقات ان کا مقصد محض عشقِ رسول کے جذبے کی تسکین بھی رہی ہے۔ اس جذبے کو بے اساس اور ایسی کاوش کو بے فائدہ قرار نہیں دیا جاسکتا، پھر بھی اہم سیرت نگاروں نے عام طور پر باضابطہ ضرورت کو عنوان بنا کر ہی خامہ فرسائی کی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ضرورت کا تعین ان کے اپنے ذہن و مزاج پر منحصر ہوتا ہے اور اس کی تشکیل میں مختلف عوامل اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ وقت کے غالب رجحانات سے اثر پذیر ہونا بھی فطری ہے۔ ابتدائی دور میں سیرت کو مغازی کا عنوان دیے جانے اور فقہ میں غزوات و جہاد سے سیرت کے احکام مراد لیے جانے کی توجیہ بھی اسی حوالے سے کی جاسکتی ہے۔[۱] لیکن بہت جلد اس رجحان میں تبدیلی آ گئی اور رسول اللہ ﷺ کی سیرت کے مختلف پہلوؤں کو بنیاد بنا کر اس موضوع پر لکھا جانے لگا۔ یہ غالباً سیرت نگاری کے رجحان میں پہلی بڑی تبدیلی تھی۔ اس کے بعد مختلف مرحلوں میں سیرت نگاری میں مختلف رجحانات پیدا ہوتے رہے۔[۲]

دورِ جدید میں سیرت نگاری کے اہم رجحانات میں سے ایک رجحان دعوت اسلامی کا بھی ہے۔ ۱۹ویں صدی کے اواخر سے برصغیر ہند اور عالم عرب میں اس موضوع پر تحریر و تصنیف کا جو سلسلہ شروع ہوا، اس میں دونوں رخ شامل تھے: داخلی بھی اور خارجی بھی۔ داخلی

رخ تھا سیرت کے حوالے سے مسلم معاشرے میں اصلاح کی روح پھونکنا ،رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے سبق آموز اور بصیرت افروز پہلوؤں سے دلوں کو منور کرنا اور ان میں عشقِ رسول کی جوت جگانا۔ مختلف تحریکوں بالخصوص احیائی واصلاحی تحریکوں نے قرآن وسنت کے علاوہ سیرت نبوی کو بھی اپنے لٹریچر میں شامل کیا۔ خارجی رخ تھا غیر مسلم مصنفین ، بالخصوص مستشرقین اور مسیحی مشنریز کی طرف سے پیغمبر اسلام کی سیرت اور آپ کے اخلاق وتعلیمات سے متعلق پھیلائی جانے والی غلط فہمیوں اور زہریلے پروپیگنڈے کے سدِّ باب کی کوشش۔ انگریزی میں اس کی سب سے اہم اور نمایاں مثال سید امیر علی کی The Sprit of Islam ہے۔ عربی میں محمد حسین ہیکل کی کتاب 'حیاۃُ محمد' بھی اسی رجحان کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس میں جابجا مستشرقین کے اعتراضات کا علمی انداز میں جواب دینے اور مغربی فکر وثقافت پر تنقید کے ساتھ اسلامی فکر وثقافت کی برتری اور دور حاضر کے لیے اس کی معنویت ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔[۳] اسی کے ساتھ معروضی انداز میں آپ کی سیرت اور تعلیمات کو اس حیثیت سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ انہی میں موجودہ دنیا کے مسائل کا حل پوشیدہ ہے[۴] اردو میں اس کی نمائندہ کتابیں شبلی نعمانی وسید سلیمان ندوی کی 'سیرت النبیؐ'، سید سلیمان ندوی کی خطبات مدراس اور قاضی محمد سلیمان منصور پوری کی 'رحمۃ للعالمین' ہیں۔ دفاعِ رسول کے نقطۂ نظر سے جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں بجائے خود یہ بات بھی شامل تھی کہ رسول اللہ ﷺ کی سیرت کے ضمن میں اسلام کی اخلاقی اور انسانی تعلیمات کا خلاصہ سامنے آجائے۔ یہی دراصل دور جدید کی سیرت نگاری میں دعوت اسلامی کے رجحان کا مقدمہ یا آغاز ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ دور جدید سے قبل تصنیف کردہ کتب سیرت میں دعوت اسلامی کے پہلوؤں سے اعتنا نہیں کیا گیا ہے، بلکہ ایسی متعدد کتابیں ہیں جن میں مختلف موضوعات پر ایسی بحثیں ملتی ہیں جو دعوت اسلامی کے موضوع سے بالواسطہ تعلق رکھتی ہیں۔ مثلاً ابن قیم کی زاد المعاد یا قاضی عیاض کی الشفاء۔ یہ ایسی کتابیں ہیں جن میں اسلام اور پیغمبر اسلام کی تعلیمات وسیرت کے مختلف موضوعات اور پہلوؤں پر عقلی انداز سے بحث کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جیسے معجزات النبی، معجزاتِ قرآنی ، دلائلِ نبوت،[۵] رسول کی بعثت کی ضرورت اور معراج النبی وغیرہ۔[۶]

دور جدید کی سیرت نگاری میں دعوتی رجحان کے عوامل

دور جدید کی سیرت نگاری میں دعوتی رجحان کے مختلف عوامل رہے ہیں۔ان میں اہم عامل عالمی سطح پر قوموں کے درمیان باہمی اختلاط وتعامل ہے۔اس کی کوئی نظیر ماضی کے کسی دور میں نہیں ملتی۔بعض ملکوں میں مسلمان غیر مسلم اقوام کے ساتھ رہتے آئے تھے،لیکن کچھ تو سیاسی وجوہ اور کچھ مسلمانوں کی اپنی کم زوریاں تھیں کہ انہوں نے ان اقوام کو مدعو کی حیثیت نہیں دی۔ اس بنا پر وہ باضابطہ طور سے ان کے لیے دعوتی لٹریچر کی تیاری پر زیادہ توجہ نہ دے سکے۔ایسے ممالک میں ہندوستان سرفہرست ہے۔دوسری عالمی جنگ کے بعد دنیا کے ممالک کی سرحدیں کھل گئیں اور اس طرح بڑے پیمانے پر مشرقی اقوام،جن میں مسلمان بھی شامل تھے،مغربی ممالک کا رخ کرنے لگیں۔ان مسلم مہاجرین میں دعوتی فکر رکھنے والے افراد کو دعوتی انداز کے لٹریچر کی ضرورت پیش آئی، جس میں اسلام سے متعلق مخالفین کے شبہات و اعتراضات کا جواب دیا گیا ہو اور وہ دعوتی مقاصد کے لیے بھی استعمال ہو سکے۔اس لٹریچر میں سیرتِ نبوی کا موضوع بھی شامل تھا۔ایک دوسرا بڑا عامل دور جدید میں اسلامی کتابوں کی بڑے پیمانے پر نشر و اشاعت بھی ہے۔ماضی میں اس کے وہ مواقع میسر نہیں تھے جو جدید تکنیکی سہولیات نے فراہم کر دیے ہیں۔ اسلام کا وہ قیمتی علمی سرمایہ، جو کئی سو سالوں سے لوگوں کی نگاہوں سے مخفی تھا، زیور طبع سے آراستہ ہو کر لوگوں کی نگاہوں میں آنے لگا۔

بیسویں صدی کے آغاز میں بعض احیائی اور اصلاحی تحریکات منظر عام پر آئیں۔وہ جہاں ایک طرف اس بات کی خواہش مند تھیں کہ مسلم ممالک کو استعمار کے نرغے سے آزاد کر کے وہاں اسلامی اقتدار کو بحال کرنے کی کوشش کی جائے،وہیں اس بات کے لیے بھی کوشاں تھیں کہ غیر مسلم اقوام کو اسلام کی خوبیوں سے واقف کرایا جائے اور سیرت رسول کے جو پہلو ان کے لیے پرکشش ہیں،ان کو خصوصی طور پر ان کے سامنے لانے کی کوشش کی جائے۔ چناں چہ ایسی جماعتوں (جماعت اسلامی،اخوان المسلمون وغیرہ) کی طرف سے اس مقصد کے لیے جو لٹریچر شائع ہوا،اس میں سیرت کی ایسی کئی کتابیں شامل ہیں جن میں یہ رجحان پایا جاتا ہے۔مثال کے طور پر اردو میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی 'سیرت سرور عالم' اور نعیم

صدیقی کی 'محسن انسانیت' کو پیش کیا جاسکتا ہے۔سیرت نگاروں میں سے وہ لوگ، جنھوں نے مغربی زبانوں میں ہی سیرت پر لکھا ہے ان کے یہاں اس رجحان کا غلبہ ہے۔ کیوں کہ ان کے براہ راست مخاطبین میں غیر مسلم افراد شامل ہیں۔وہ ان کے مزاج و مذاق سے آشنا ہیں، ساتھ ہی ان میں سے بہتوں کو ماضی قریب کے مستشرقین اور حال کے مغربی اسکالرس کے نتائج فکر کو اسلام اور پیغمبر اسلام کے تعلق سے پڑھنے کا موقع ملا ہے۔پچھلی دو دہائیوں کے درمیان دو واقعات ایسے پیش آئے جن کی وجہ سے عمومی سطح پر اور خاص طور سے سیرت کے سلسلے میں دعوتی رجحان میں وہ اضافہ ہوا جو گزشتہ کئی صدیوں میں نہیں ہوا تھا۔ان میں سے ایک انٹرنیٹ کی ایجاد ہے اور دوسرا گیارہ ستمبر کا تاریخی واقعہ۔انٹرنیٹ کی ایجاد اور پھیلاؤ کے بعد علما اور داعیانِ کرام کے علاوہ عام اسلامی فکر رکھنے والے افراد کو بھی اپنے طور پر دعوت کے کام میں مشغول ہونے کا موقع آسانی کے ساتھ میسر آ گیا۔اسی طرح ایسی درجنوں سائٹس ہے اور ان کے لیے ان کے مطابق لٹریچر منظر عام پر آ گیا، جو سیرت کے پیغام کو عام کرنے کے لیے وقف ہیں۔۱۱ر ستمبر نے دنیا کے نقشے کو ہی بدل کر رکھ دیا۔اس واقعے سے تاریخ کا ایک نیا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔اس کے بعد پچھلے دس برس کے عرصے میں خاص طور پر دفاع و نصرت رسول کے پہلو سے سیرت نگاری میں دعوت اسلامی کا رجحان مضبوط تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔

دعوتی رجحان کے دو اہم پہلو

سیرت نگاری میں دعوتی رجحان کے دو اہم پہلو ہیں: ایک یہ کہ سیرت کے واقعات اور آپ کی تعلیمات کا ایسا تعارف کرایا جائے کہ وہ غیر مسلموں کے لیے باعث کشش ہوں، ان سے پیغمبر اسلام کے تعلق سے ان کی غلط فہمیوں کا ازالہ ہو سکے اور وہ یہ جان سکیں کہ آپ کی شخصیت اور پیغام انسانیت کے لیے سراسر رحمت ہے۔اس بنیاد پر ان کا ذہن اور جذبات اسلام کا ساتھ دینے کے لیے اپنے اندر آمادگی پائیں۔دوسری طرف وہ ایسے مسلمانوں کے لیے بھی مفید ہوں جن کا ذہن مستشرقین اور مغربی اسکالرس کی قدیم و جدید تحریروں کو پڑھ کر متاثر ہو چکا ہے۔موجودہ دور میں اسلام مخالف پروپیگنڈہ سے متاثر ایسے مسلمانوں کا حلقہ کافی وسیع ہوا ہے۔اس پہلو پر اردو میں سیرت النبی، رحمت عالم (سید سلیمان ندوی)، رحمۃ للعالمین اور

پیغمبر انسانیت (جعفر شاہ پھلواروی) جیسی کتابیں، عربی میں نبی الرحمۃ (مسعد یاقوت) اور نبی الانسان (جعفر ماجد) جیسی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ انگریزی میں The Sprit of Islam کے علاوہ In the Foot Step of Prophet Muhammad (Tariq Ramadan), Muhammad Blessing for Humankind (Afzalur Rahman), The Prophet of Universal Brotherhood جیسی کتابیں اہم ہیں۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ اسلام کے داعئ اول (حضرت محمد ﷺ) کے اوصاف، دعوت کے مختلف مراحل میں پیش آنے والے واقعات اور آپؐ کے دعوتی تجربات کو اس طرح پیش کیا جائے کہ وہ آج کے داعیانِ دین کے لیے مشعل راہ کا کام دے سکیں۔ چوں کہ اب تک عموماً اردو یا عربی میں جو کتابیں لکھی جاتی رہی ہیں، ان کے براہ راست مخاطب مسلمان تھے، اس لیے اول الذکر پہلو پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی، لیکن حالیہ عرصے میں ایسی کتابوں میں بھی غیر مسلم ذہنوں کی رعایت کی گئی ہے۔ البتہ اس وقت جو کتابیں مغربی زبانوں یا ایسی علاقائی زبانوں میں لکھی جارہی ہیں، جن میں مسلم اور غیر مسلم دونوں مساوی طور پر مخاطب ہیں، وہ خاص طور پر دعوت اسلامی کے لحاظ سے اہمیت کی حامل ہیں۔ البتہ دوسرے پہلو پر خاص طور پر عربی میں متعدد اچھی اور اہم کتابیں سامنے آئی ہیں۔ ان کتابوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: ایک تو وہ کتابیں ہیں جن میں مجموعی طور پر آپؐ کی پوری سیرت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ دوسرے وہ کتابیں جن میں آپ کی شخصیت یا وقائعِ سیرت کے کسی ایک پہلو کو عنوان بنایا گیا ہے، جیسے آپ کی مکی یا مدنی زندگی یا آپ کی سپہ سالار جنگ یا سربراہ ریاست کی حیثیت۔ جو کتابیں مجموعی طور پر پوری سیرت کو موضوع بنا کر لکھی گئی ہیں ان میں: **السیرۃ النبویۃ: دروس و عبر (مصطفی السباعی)، فقہ السیرۃ (محمد الغزالی)، وقفات تربویۃ مع السیرۃ النبویۃ (احمد فرید)، منہج النبی فی الدعوۃ من خلال السیرۃ الصحیحۃ (محمد امحزون)** وغیرہ قابل ذکر ہیں، جب کہ سیرت کے جزئی پہلوؤں کو موضوع بنا کر **منہج الدعوۃ النبویۃ فی المرحلۃ المکیۃ (علی بن جابر الحربی)، منہج النبی فی حمایۃ الدعوۃ والمحافظۃ علی منجزاتہا خلال الفترۃ المکیۃ (الطیب**

برغوث)، منهج الرسول فی دعوة اهل کتاب (محمد بن سیدی الحبیب الشنقیطی) وغیرہ لکھی گئی ہیں۔اردو میں بھی متعدد کتابیں کلّی اور جزوی دونوں پہلوؤں سے لکھی گئی ہیں۔ اگر چہ وہ خالصتاً دعوت کے عنوان سے نہیں ہیں، لیکن موضوع ومراد کے لحاظ سے ان کا مزاج دعوتی ہے۔اس پہلو سے لکھی گئی ان کتابوں میں آپؐ کی سیرت کو آج کی سماجی و تمدّنی زندگی کے لیے آئینہ بنانے اور اسے اس طرح پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ وہ اسلام کے داعیٔ اول کی سوانح ہے جو موجودہ اور آئندہ زمانے میں دعوتی کام کی بنیاد اور لائحہ عمل فراہم کرتی ہے۔ جو کتابیں براہ راست دعوت کے عنوان سے لکھی گئی ہیں ان میں داعی، مدعو، موضوعاتِ دعوت، اسلوبِ دعوت، دعوت کے مقاصد اور اس راہ میں آنے والی مشکلات وغیرہ کو باضابطہ ابواب وفصول کے تحت بیان کیا گیا ہے۔مثلاً وہبہ الزحیلی کی کتاب **منهج الدعوة فی السیرة النبویة** کے عنوانات اس طرح ہیں: **الاسباب و الغایات للدعوة الاسلامیة، اصول الدعوة الاسلامیة، مصاعب الدعوة، صبر الداعیة و سمّو سماحته، منطلقات الدعوة، اثر النجاح فی الدعوة، نبذ الامتیازات فی میزان الدعوة الاسلامیة، موقف الرأسمالیین العتاة من الدعوة** ۸۔ان عناوین سے ان کے مشمولات کا بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔مولانا مودودیؒ کی 'سیرت سرور عالم' اپنی مخصوص فکر کے تحت لکھی گئی ہے، تاہم مجموعی طور پر وہ مسلمانوں کے داعیانہ منصب اور اس کے لوازم پر لکھی جانے والی چند اہم کتابوں میں سے ایک ہے۔صبر، حکمت، بے غرضی وغیرہ پر مولانا کی تحریریں مؤثر اور دل آویز ہیں۔۹ اس میں تمام واقعاتِ سیرت کو دعوتِ اسلامی کے سیاق میں دیکھنے اور ان سے دعوتی عمل کا مواد اخذ کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔اس ضمن میں 'پیغمبرِ اسلام' (مولانا وحید الدین خاں) کا بھی تذکرہ کیا جاسکتا ہے۔مشمولات کے بعض حصوں سے اختلاف کے باوجود اس پہلو پر وہ ایک اچھی اور مفید کتاب ہے۔

یہ اس رجحان کا نمایاں پہلو ہے۔اس لیے اس کے تفصیلی تجزیے کی بہ ظاہر ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔ عام طور سے اس پہلو پر لکھنے والوں نے آپؐ کی داعیانہ حکمت وبصیرت، صبر و شجاعت، جفاکشی، خود اعتمادی، مذہب سے قطع نظر باصلاحیت لوگوں سے فائدہ اٹھانے کوشش

وغیرہ جیسے اہم داعیانہ نکات اور پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔اس اعتبار سے اس کے اور پہلو کے مضامین کا جائزہ لینا مناسب ہوگا۔

دعوتی رجحان کے مضامین: ایک مختصر جائزہ

عام طور پر سیرت نگاروں نے آپؐ کی شخصیت کو اس انداز میں پیش کرنے کوشش کی ہے کہ مختلف حیثیتوں سے آپؐ کی عظیم شخصیت کے نقوش ذہنوں میں مرتسم ہوجاتے ہیں، تاہم ان پر عقیدت ومحبت کا رنگ زیادہ گہرا ہونے کی وجہ سے، جو ایک حد تک عشقِ رسول کا تقاضا بھی ہے، وہ مسلمانوں کے لیے جتنے پرکشش ہوسکتے ہیں، غیر مسلموں کے لیے ان میں اتنی کشش نہیں ہوتی۔ سیرت نگاروں کی بڑی تعداد ایسی ہے جو واقعاتِ سیرت کے بیان میں غیر مسلم ذہنوں میں اٹھنے والے سوالات سے یا تو بحث ہی نہیں کرتی، یا اس کا انداز بہت علمی اور قائل کرنے والا نہیں ہوتا۔اردو میں شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی، قاضی محمد سلیمان منصور پوری، ابوالاعلی مودودی اور جعفر شاہ پھلواروی وغیرہ اور عربی میں حسین ہیکل، مصطفیٰ سباعی، محمد الغزالی، ابوزہرہ اور انگریزی میں امیر علی، محمد حمید اللہ اور طارق رمضان وغیرہ کے یہاں اس بات کی رعایت ملتی ہے کہ غیر مسلم ذہنوں میں پیدا ہونے والے مختلف سوالات کو بھی باضابطہ طور پر دور کرنے کی کوشش کی جائے، یا موضوع کو اتنا کھول کر بیان کیا جائے کہ ان پر کم سے کم اشکالات وارد ہوں۔اسی کے ساتھ ان کتابوں میں عقلی اور معروضی انداز میں سیرت نبوی کے حوالے سے اسلامی تعلیمات کو دور جدید سے مربوط کرکے دنیاے انسانیت کے آخری جامع عملی منشور کی حیثیت سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ سیرت النبی، خطبات مدراس اور دی اسپرٹ آف اسلام کی یہی امتیازی شناخت ہے۔خطباتِ مدراس کا تیسرا، چوتھا، پانچواں اور چھٹا خطبہ اسلام اور پیغمبر اسلام کا شان دار دعوتی تعارف کراتا ہے۔ اس کا ایک امتیازی پہلو، جو عام طور پر دوسری جگہ نظر نہیں آتا، یہ ہے کہ اس میں دنیا کے دیگر رہ نماؤں اور ان کی تعلیمات سے منطقی انداز میں آپؐ کا تقابل کرکے آپ کے امتیاز کو ثابت کیا گیا ہے۔[۱۰]

باضابطہ مضامین کے تعلق سے دیکھا جائے تو دعوتی رجحان رکھنے والے سیرت نگاروں نے آپ کی حیات وصفات اور پیغام کے درج ذیل پہلوؤں کو خصوصیت کے ساتھ توجہ کا مرکز بنایا ہے:

- پیغام سیرت (اسلام) کی جامعیت اور ہمہ گیری
- اجتماعی اخلاقی اقدار کا احیا واشاعت
- انسانیت نوازی یا انسانیت پسندی
- دین ودنیا کا امتزاج رکھنے والے شان دار تمدن کی تخلیق
- رحمۃ للعالمین ہونے کی حیثیت
- امن وعدل کے قیام کی کوشش
- غیر مسلموں کے ساتھ اعلیٰ انسانی اخلاق پر مبنی سماجی برتاؤ
- آپؐ کی سادہ اور مکمل سماجی زندگی
- کم زور طبقات (خواتین، غلام اور بچے) کی رعایت اور ان کے سماجی مرتبے کو بلند کرنا وغیرہ۔

ذیل میں ان میں سے چند اہم موضوعات پر بعض سیرت نگاروں کے افکار وخیالات کا مطالعہ پیش کیا جارہا ہے:

انسانیت نوازی

رسول اللہ ﷺ کا بہ حیثیت انسان رویہ یا انسان پسندی پر اردو اور عربی میں درجنوں کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مثلاً اردو میں پیغمبر انسانیت، محسن انسانیت، انسانِ کامل (خالد علوی)، عربی میں **النبی الانسان** (محمود تیمور)، **محمد: نبی الانسان** (جعفر ماجد) وغیرہ۔ یہ رجحان اُس رجحان کا ایک ردعمل معلوم ہوتا ہے کہ بعض جدید وقدیم سیرت نگاروں نے رسول اللہ ﷺ کی روحانی شخصیت اور آپ سے صادر ہونے والے معجزات کے پہلو پر اس شدت کے ساتھ زور دیا ہے کہ اس کا انسانی پہلو دب کر رہ گیا ہے اور آپؐ کی شخصیت پر اسطوری اور مافوق البشری رنگ حاوی ہوگیا ہے، جو خود مسلمانوں کے لیے بھی سیرت کے صحیح فہم میں رکاوٹ ہے۔ غالبا بعض سیرت نگاروں[۱۱] کے اس موقف کے پس پشت کہ آپؐ کو قرآن کے علاوہ کوئی دوسرا معجزہ نہیں دیا گیا، ایک بڑا عامل یہی رہا ہے۔ شیخ ابو زہرہ نے اپنی کتاب 'خاتم النبیین' میں متعدد جگہوں پر انسانیت نوازی کے پہلو پر گفتگو کی ہے۔[۱۲] دستور مدینہ کی حیثیت پر تبصرہ کرتے ہوئے انہوں نے اس کے، مذہبی اور گروہی بنیاد کے بجائے انسانی بنیاد پر تشکیل کیے جانے کا

نہایت اہمیت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔[۱۳] خالد علوی نے انسان کامل میں آپ کے احترام آدمیت کے وصف پر روشنی ڈالی ہے۔[۱۴] اخوت انسانی اور مساوات کو خطبات مدراس میں بھی علمی انداز میں موضوع بنایا گیا ہے۔[۱۵] 'پیغمبر انسانیت' میں آپؐ کی انسانیت نوازی اور انسانیت پسندی کو کافی ابھارا گیا ہے۔ 'محسن انسانیت' بھی ایک شاہ کار ہے۔ اس میں آپ کے محسن انسانیت ہونے کے اہم پہلوؤں کو وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ البتہ اس پر تحریکی رنگ غالب ہے، جس کی وجہ سے غیر مسلموں کے لیے اس میں تاثیر اور دعوتِ فکر کا پہلو باقی نہیں رہ جاتا۔ 'پیغمبر انسانیت' میں مختلف مواقع پر اسلام کو دینِ انسانیت اور پیغمبرِ اسلام کو پیغمبرِ انسانیت کے طور پر جس خوبی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، وہ دعوتی لحاظ سے اہمیت رکھتا ہے۔[۱۶] امیر علی اسلام کا سب سے اہم مقصد خدا کی وحدت اور انسانی مساوات کے قیام کو بتاتے ہیں۔[۱۷] ابوالکلام آزاد نے 'رسول رحمت'[۱۸] میں اور ڈاکٹر حمید اللہ نے 'رسول اکرم کی سیاسی زندگی' میں رسول اللہ ﷺ کے احترامِ آدمیت کے موقف پر اچھے انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ اسی طرح 'رحمۃ للعالمین' کے ساتویں باب میں اسلام اور پیغمبر اسلام کے انسانیت پر احسانات کی نہایت خوبی کے ساتھ عکاسی کی گئی ہے۔ طارق رمضان نے اپنی کتاب In the foot steps of the Prophet کے بارے میں لکھا ہے کہ انہوں نے اسے رسول اللہ کی پیغمبری اور انسانیت کے پہلو کو آشکارا کرنے کے لیے تصنیف کیا ہے۔[۱۹] اور یہ بالکل صحیح ہے۔ افضال الرحمٰن نے علم کو آپ کی انسانیت نوازی کی اہم مثال کے طور پیش کیا ہے۔ آپ کی معلم کی حیثیت کو واضح کرتے ہوئے انہوں نے انتہائی شرح وبسط کے ساتھ یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ عہد وسطی میں مسلمانوں کے ذریعے اور دور جدید میں اہل مغرب کے ذریعے علوم وتمدن کی جو ترقی ہوئی وہ کس طرح آپ کی ذات اور تعلیمات کی رہین منت ہے۔[۲۰] اس کا انداز معروضی اور منطقی ہے، جو بلاشبہ عام ذہنوں کو اپیل کرنے والا ہے۔

مسلم غیر مسلم تعلقات

مسلم غیر مسلم تعلقات کا موضوع موجودہ دور میں نہایت اہم اور حساس ہوگیا ہے۔ غیر مسلم حلقوں میں اسے خاص طور پر موضوع بحث بنایا گیا ہے اور یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی

ہے کہ: ''جیسے آپؐ کو یہ منظور نہ تھا کہ آپ کے متبعین غیر مسلموں کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھیں''۔[۲۱] اردو مصنفینِ سیرت میں شبلی نعمانی وسید سلیمان ندوی، حمید اللہ اور یٰسین مظہر صدیقی کی تحریروں میں اس موضوع پر اچھا مواد موجود ہے۔ حمید اللہ کی 'محمد رسول اللہ' اور اس کے علاوہ جزوی موضوعاتِ سیرت پر لکھی گئی ان کی دوسری کتابیں مثلاً: 'رسول اللہ کی سیاستِ خارجہ'، 'رسولِ اکرم کی سیاسی زندگی' وغیرہ میں اس موضوع پر جس انداز میں اظہارِ خیال کیا گیا ہے، اس سے رسول اللہ ﷺ کے غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات کا نہایت مثبت نقشہ سامنے آتا ہے۔ امیر علی نے 'دی اسپرٹ آف اسلام' میں اس موضوع کا تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے اور نہایت معروضی انداز میں پیغمبرِ اسلام اور مسلم حکم رانوں کے غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات کی تفصیل پیش کی ہے۔[۲۲] سیرت النبی کا انداز بھی یہی ہے۔ البتہ ڈاکٹر حمید اللہ نے زیادہ خوبی اور تفصیل کے ساتھ اس موضوع سے بحث کی ہے اور دلائل کے ساتھ بتایا ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ آپ کے مدینہ میں پرامن سماجی تعلقات تھے۔ وہ ان سے لین دین کرتے، ان کی خوشی وغم کی تقریبات میں شریک ہوتے اور ایک برابر کے شہری اور سماجی فرد کا کردار ادا کرتے تھے۔ ان کو شہر میں تجارت وحرفت کی پوری آزادی رہی، حتی کہ خود حضور اکرمؐ کی زرہ کچھ ادھار لینے کے سبب ایک یہودی کے پاس گروی تھی اور اسی حالت میں آپ نے وفات پائی۔ یہودی ہم سایوں کی آپ مدارات کرتے اور بنفس نفیس ان کے بیماروں کی عیادت کرتے، ان کے جنازے گلیوں میں سے گزرتے اور آپ بیٹھے رہتے تو موت کے خدائی فعل کے احترام میں کھڑے ہوجاتے''[۲۳]۔ ان پرامن سماجی تعلقات میں دراڑ خود یہود کی شرارتوں سے آئی۔ لیکن جب ''ان کی شرارتیں کم ہوگئیں تو اسلامی حکومت کا برتاؤ بھی ان کے ساتھ انتہائی مرحمت کا ہوگیا۔ ان کے غریب قبائل کو سرکاری خزانے سے روزینے مقرر ہوگئے''۔[۲۴] ابن سعد اور زرقانی کے حوالے سے انہوں نے ام المومنین حضرت صفیہؓ کے بارے میں لکھا ہے کہ انہوں نے اپنی ایک تہائی جائداد اپنے یہودی بھانجے کے نام وصیت فرمائی اور یہ کہ ''اسلام ایسی صلہ رحمی اور فراخ دلی کی حوصلہ افزائی ہی کرتا ہے''۔[۲۵] ڈاکٹر یٰسین مظہر صدیقی نے لکھا ہے: ''سیرت نبوی کی روایات سے واضح ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی بعثت کے بعد اپنے غیر مسلم رشتہ داروں اور دوسرے ہم

وطنوں کے ساتھ بھی تمام سماجی تعلقات کو برقرار رکھا، ان کے ساتھ تمام قومی، ملکی اور تہذیبی امور میں اشتراک جاری رکھا، بلکہ مزید اخلاق کا مظاہرہ کیا، تاکہ غیر مسلموں پر یہ واضح ہو کہ اسلام حسن اخلاق کا دین ہے اور اپنے اور بیگانوں سب کے لیے رحمت عام ہوتا ہے''۔۲۶

ڈاکٹر حمید اللہ کے یہاں مدنی اور ڈاکٹر صدیقی کے یہاں مکی سماج میں غیر مسلموں کے ساتھ روابط کو زیادہ مرکزّ اور مربوط انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ انگریزی میں مختلف مصنفین نے اس پہلو کو اپنی خصوصی توجہ کا مرکز بنایا ہے۔ طارق رمضان کے مطابق ''آپ کے غیر مسلموں سے نہایت مضبوط تعلقات (very strong ties) تھے۔ اور یہ کہ آپ نے ان کے ساتھ تعلقات باہمی اعتماد اور اصول کی پاس داری کی بنیاد پر قائم کیے، نہ کہ خاص طور پر مشترکہ مذہب اور عقیدے کی بنیاد پر''۲۷ انہوں نے اس ضمن میں یہ بھی دکھانے کی کوشش کی ہے کہ آپ کی نظر میں ہر شخص کو اس حد تک اختیار عقیدہ کی آزادی تھی کہ آپؐ نے بعض افراد کو اسلام سے پھر جانے کے باوجود اس کی سزا نہیں دی۔ ارتداد کی سزا کا پس منظر ان کی نظر میں یہ ہے کہ مدینہ میں بعض یہودی ایسا سازش کے طور پر اسلامی ریاست کو کم زور کرنے کے لیے کرتے تھے۔۲۸ اسی طرح ہجرت کے موقع پر عبداللہ بن اریقط کو سفرِ ہجرت میں رہنما بنائے جانے یا طائف سے لوٹنے کے بعد مطعم بن عدی کی پناہ میں رسول اللہ ﷺ کے مکہ میں داخل ہونے کے واقعات کو اس تناظر میں پیش کیا ہے کہ سماجی معاملات میں عقیدے سے قطع نظر غیر مسلمین حتی کہ دشمن جماعت کے افراد کی امانت و دیانت پر اعتماد کرنے میں بھی آپ کو کوئی ذہنی رکاوٹ نہیں تھی۔ طارق رمضان نے لکھا ہے کہ ''جب آپؐ مدینہ آئے تو آپ نے یہودیوں سے بہت اچھے تعلقات قائم کیے، آپ کو کسی کے مذہب کو بدلوانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ بعد میں معاہدہ شکنی کی وجہ سے تعلقات میں کھٹاس آئی، تب بھی مشترکہ شناخت اور احترام میں فرق نہیں آیا''۔۲۹ شبلی نے کفار و مشرکین اور اہل کتاب کے ساتھ آپ کے برتاؤ پر معروضی انداز میں روشنی ڈالی ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ آپ نے ان کے ساتھ تعلقات میں انسانی اقدار کی مکمل رعایت کی اور اپنے اعلیٰ اخلاق کا مظاہرہ کیا۔۳۰ بہر حال دعوتی رجحان کے تناظر میں یہ پہلو بھی نہایت اہمیت کے ساتھ سیرت نگاروں کے پیش نظر رہا ہے۔۳۱

جہاد

جہاد کا موضوع بھی مسلم غیر مسلم تعلقات سے ہی وابستہ ہے۔ جدید دور کے متعدد سیرت نگاروں نے روایتی انداز سے ہٹ کر اس موضوع پر بحث کی ہے۔ عرب مصنفین میں ابوزہرہ، مصطفیٰ سباعی اور محمد الغزالی وغیرہ نے زور دے کر یہ بات کہی ہے کہ اسلام میں مسلم غیر مسلم تعلقات کی بنیاد جنگ پر نہیں، بلکہ امن پر ہے۔ اور یہ کہ جہاد (بمعنی قتال) یا تو دفاع کے لیے ہے یا فتنہ کی صورت حال کے خاتمے اور اسلامی دعوت کے سامنے کھڑی کی جانے والی رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے۔۳۲ ایک دوسری جگہ ابوزہرہ نے لکھا ہے کہ قتال صرف جزیرۃ العرب کے لوگوں کے لیے تھا، باقی لوگوں کے لیے صرف پرامن دعوت کا حکم تھا۔۳۳ 'رسول رحمت' میں ابوالکلام آزاد نے بھی اسی نقطۂ نظر کا اظہار کیا ہے۔۳۴

ابوزہرہ جہاد کو دعوت اسلامی کے تعلق سے مجبوری کے انتخاب پر محمول کرتے ہیں، جس سے احتراز ہی بہتر ہے۔۳۵ اس کی تائید میں وہ رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث کو پیش کرتے ہیں: **لا تتمنّوا لقاء العدو وسلوا اللہ العافیۃ فاذ القیتموھم فاصبروا**۳۶ "دشمن سے مقابلے کی خواہش نہ کرو، بلکہ اللہ سے عافیت طلب کرو، البتہ دشمن سے مڈبھیڑ ہوجائے تو پیچھے نہ ہٹو"۔ سیرت النبی میں شبلی نعمانی نے بھی جہاد کو صرف دفاع تک محدود کیا ہے۔۳۷ مصطفیٰ سباعی بھی اسی کے قائل ہیں۳۸ ان کی نظر میں جنگ کا مقصد یہ بھی ہے کہ بت پرستوں اور ملحدین کا زور توڑ کر یہود ونصاریٰ کی عبادت گاہوں کی حفاظت کی جائے۳۹ اپنی کتاب **ھذا ھو الاسلام** میں انہوں نے اپنا موقف ان الفاظ میں بیان کیا ہے: "اسلامی جہاد کا مقصد یہ نہیں ہے، جیسا کہ دشمنانِ اسلام سمجھتے ہیں، کہ مسجد کو کنیسہ کے ملبے پر تعمیر کیا جائے، بلکہ یہ ہے کہ وہ کنیسہ کے بغل میں اس علامت کے طور پر قائم کی جائے کہ اللہ کی عبادت مختلف طریقوں سے کی جاسکتی ہے"۔۴۰ ڈاکٹر حمید اللہ کی بھی یہی رائے ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "مسلمانوں کے لیے دوسروں کے خلاف جنگ محض ایک دفاعی کارروائی ہے"۔۴۱ ان کی یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ: "اصل میں آں حضرتؐ نے دشمن کو نیست ونابود کرنے کی جگہ مجبور

کرنا پسند فرمایا'' ۴۲؎۔ 'محمد رسول اللہ' میں انہوں نے لکھا ہے کہ: ''رسول اللہ نے ہچکچاہٹ کے ساتھ صرف دفاع کے لیے جنگیں لڑی تھیں... جب اسلام کے پرانے دشمنوں نے اپنی بے وقوفانہ دشمنی ختم کردی تو آپ کا مقصد صرف اور صرف یہ رہ گیا کہ عرب کے ساتھ غیر ممالک میں پُرامن طریقے سے دین اسلام کی تشہیر کی جائے''۔۴۳؎ انگریزی کے بہت سے مصنفین نے یہی موقف اختیار کیا ہے کہ آپؐ کی جنگیں بنیادی طور پر دفاع کے لیے تھیں، البتہ اقدامی طور پر جو جنگیں آپ نے لڑیں ان کا مقصد محض فتنہ کی صورت حال کا خاتمہ تھا۔ حسین ہیکل کے نزدیک جنگ صرف اس عقیدے کی حفاظت کے لیے جائز ہے جو اللہ کے دین سے مربوط ہے۴۴؎۔ طارق رمضان نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ آپ نے بنیادی طور پر جہاد قرآن سے کیا اور اسی کا آپ کو حکم دیا گیا تھا۔ آپ نے اصلاً قرآن کو ہی اسلحہ بنایا۴۵؎۔ ڈاکٹر افضال الرحمان نے اس تعلق سے وہی بات کہی ہے ۴۶؎ جو موجودہ دور میں غالباً پوری اہمیت اور دلیل کے ساتھ ڈاکٹر حمید اللہ نے کہی تھی کہ رسول اللہ کی پالیسی جنگ کے ذریعے محض یہ تھی کہ ان (غیر مسلم مخالفین) کی طاقت توڑ دی جائے، تاکہ وہ تعاون پر آمادہ ہوجائیں اور خون بہانے کی ضرورت پیش نہ آئے۔ حمید اللہ نے بہت سے دیگر مصنفین کے بالکل برعکس اپنی کتاب 'محمد رسول اللہ' میں غزوات وسرایا کے بیان کو بالکل ضمنی اہمیت دی ہے، چناں چہ اس میں سرے سے اس کا کوئی باضابطہ عنوان ہی نہیں رکھا ہے۔

رحمۃ للعالمین ہونے کی حیثیت

اس تعلق سے موجودہ غالب رجحان آپؐ کے داعیٔ امن اور رحمۃ للعالمین ہونے کی حیثیت کو نمایاں طور پر پیش کرنے کا ہے۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، آپ کی اس حیثیت پر ماضی میں اردو اور عربی میں درجنوں کتابیں لکھی گئی ہیں۔ حال میں اس میں قابل قدر اضافہ ہوا ہے۔ نیز جو کتابیں یا تحریریں دوسرے عنوانات سے لکھی گئی ہیں ان میں بھی اس پہلو پر خصوصیت کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ کام بہت تحقیقی اور منظّم شکل میں سامنے نہیں آیا۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اس موضوع پر زیادہ تر چیزیں دراصل انٹرنیٹ کے ذریعے دعوت

کی ضرورت کی تکمیل یا مغربی ممالک میں اسلامی حلقوں کی طرف سے غیر مسلموں کے درمیان اشاعت کی غرض سے لکھی گئی ہیں۔ دوسری وجہ اس موضوع کی مخصوص نوعیت بھی ہے۔ دراصل یہ تحریریں ان لوگوں کو پیش نظر رکھ کر تیار کی گئی ہیں جو حالیہ عرصے میں انتہا پسندی کے بعض واقعات سے متاثر ہوکر پیغمبر اسلام کی تعلیمات کو اس حوالے سے موردطعن ٹھہراتے رہے ہیں۔ ظاہر ہے، یہ طبقہ ماضی کے اصحاب علم و دانش مستشرقین کی طرح نہیں ہے۔

اردو میں اس عنوان سے قاضی محمد سلیمان منصور پوری کی 'رحمۃ للعالمین' کا بدل شاید عربی میں بھی نہیں ہے۔ قاضی صاحب نے غیر مسلم ذہنوں کو سامنے رکھ کر رسول اللہ ﷺ کی شخصیت میں رحمت کے تمام ضروری پہلوؤں کو منطقی انداز میں آشکارا کرنے کی کوشش کی ہے۔ غالباً پہلی مرتبہ انہوں نے عہد نبوی کی جنگوں کے مقتولین اور قیدیوں کی تعداد کا صحیح اندازہ کرکے یہ بتانے کی کوشش کی کہ انسانی تاریخ کا سب سے بڑا انقلاب رحمتِ عالم ﷺ کے ذریعے سب سے کم خون بہاکر لایا گیا۔[۴۷] عربی میں حالیہ زمانے میں کئی مصنفین نے اسی عنوان سے کتابیں لکھی ہیں، لیکن محمد مسعد یاقوت کی کتاب **نبی الرحمۃ: الرسالۃ والانسان**[۴۸] اس موضوع پر زیادہ اہم ہے۔ یہ کتاب ایک غیر مسلم مصنف کریک وینن کی کتاب نبی الخراب (Prophet of Demon) کے ردعمل میں لکھی گئی ہے۔ مصنف نے آپ کے رحمت عالم ہونے کے تقریباً تمام اہم پہلوؤں کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے۔ اس میں تمدن، اخلاق، قانون، سیاست ومعاشرت، انسانیت کی خدمت، قیام عدل و امن، غیر مسلمین، خواتین، کم زور طبقات وغیرہ کے حوالے سے آپ کی سیرت کو رحمت اور احسان کی شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ڈاکٹر اکرم ضیا عمری نے بھی الرسالۃ والرسول میں آپ کے نبی رحمت ہونے پر اچھے اور مؤثر انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ آپ کا جوہر رسالت آپ کا رحمت للعالمین ہونا ہے۔[۴۹] عربی میں نورالدین ابولحیہ، حسن عبداللہ اور ابوعبدالرحمان وغیرہ کی رحمۃ للعالمین ہی کے نام سے کتابیں موجود ہیں، لیکن اپنے مواد واسلوب کے اعتبار سے وہ بہت زیادہ موثر نہیں ہیں، تاہم ان میں سیرت کے اس پہلو کو مرکز توجہ بنا کر دعوتی انداز میں اس پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

دوسرے موضوعات میں سماجی امن پر علامہ شبلی اور ڈاکٹر حمید اللہ کی تحریروں میں مؤثر نکات موجود ہیں۔ شبلی لکھتے ہیں کہ: ''سرور کائنات کا اصلی کام تمام عالم میں دعوتِ اسلام کا اعلان کرنا تھا..... اس کے لیے تیغ وخنجر اور فوج وعسکر کی ضرورت نہ تھی، بلکہ صرف اس قدر کافی تھا کہ دعوت حق کی صدا اطرافِ عالم میں پہنچ جائے''۔۵۰ اسی طرح وہ کہتے ہیں کہ ''زیادہ تر سرایا تبلیغی وفود تھے جو فتح مکہ کے بعد بھیجے گئے''۔۵۱ امن کی طرح عدل کو بھی مختلف سیرت نگاروں نے توجہ کا مرکز بنایا ہے۔ ابوزہرہ کہتے ہیں کہ ''عدل میں عدل اجتماعی کا مفہوم شامل ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر انسان بھرپور طور پر باعزت زندگی گزارے، اس کی صلاحیتوں کو انفرادی واجتماعی فائدے کے کاموں میں استعمال کیا جائے اور ہر انسان کو یہ موقع فراہم کیا جائے کہ وہ اپنی جسمانی یا عقلی قوتوں کو بروئے کار لا سکے''۔۵۲ عدل وانسانیت کے موضوع پر قدیم سیرت نگار عموماً حلف الفضول کا تذکرہ بہت سرسری طور پر کرتے تھے، لیکن اب اکثر سیرت نگاروں کے یہاں اس پہلو پر خصوصی زور ملتا ہے۔۵۳

خلاصۂ بحث

کم از کم اردو میں سیرت نگاری میں دعوت اسلامی کا رجحان بہت واضح اور مضبوط نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی سیرت کو ایک بڑے ماڈل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، لیکن عام طور پر سیرت نگار ایسے پہلوؤں سے دامن بچانے کی کوشش کرتے ہیں، جن سے غیر مسلم ذہنوں میں سوالات پیدا ہو سکتے ہوں۔ پہلے لکھی گئی کتابوں میں سیرت نبوی کے اہم متعلقہ واقعات: حلف الفضول، ہجرت حبشہ، مکہ میں قریش اور مدینہ میں یہودیوں کے ساتھ آپ کے سماجی تعلقات، میثاق مدینہ جیسے موضوعات کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دی گئی تھی، لیکن اب خصوصیت کے ساتھ دی جارہی ہے۔ آپ کے رحمۃ للعالمین ہونے کی مختلف حیثیتوں اور جہتوں پر وسیع اور وقیع کام ہوا ہے اور ایک بڑا ذخیرہ کتب ومقالات کی شکل میں سامنے آ گیا ہے۔ بلاشبہ ان کے نتائج میں یہ بات شامل ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے متعلق بڑے پیمانے پر غلط فہمیوں کا ازالہ ہوا ہے۔ ان کوششوں کے فیضان ہی میں یہ بات شامل ہے کہ حالیہ عرصے میں بعض غیر مسلموں نے بھی رسول اللہ ﷺ کی سیرت پر نہایت مثبت اور منصفانہ انداز میں کتابیں لکھی ہیں، جن

میں کیرن آرم اسٹرانگ کی کتاب Mohdmmad :The Saviour of the Humanity خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔اس رجحان کے حوالے سے ابھی اہمیت اور سنجیدگی کے ساتھ کام کرنے کی ضرورت ہے۔مغربی ممالک میں مقیم بہت سے مسلم مصنفین نے اس پر قلم اٹھایا ہے، لیکن ان کے یہاں یہ کمی پائی جاتی ہے کہ ان کی فکر حالات سے زیادہ متاثر ہے۔اس لیے عموماً سیرت کی صحیح اور مکمل ترجمانی ان کی کتابوں سے نہیں ہو پاتی۔اس لیے خصوصاً ثقہ علما اور اہل دانش کی طرف سے اس موضوع پر تصنیف وتالیف کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

موجودہ دور کا تقاضا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی مکی زندگی کو خاص طور پر تحقیق وتصنیف کا موضوع بنایا جائے۔ یہ مسلم اقلیتوں کے فائدے کے علاوہ بہت سی غلط فہمیوں کے ازالے کا بھی باعث ہے۔اس موضوع پر میری معلومات کی حد تک عربی میں بھی کوئی قابلِ ذکر کتاب نہیں لکھی گئی ہے۔ ہجرتِ حبشہ، میثاقِ مدینہ، غزواتِ نبوی کی حیثیت، سیرت کی روشنی میں بین مذاہبی تعلقات اور بین مذاہبی کش مکش کے خاتمے کے لیے آپ کی تعلیمات اور اسوے کی اہمیت، موجودہ دور کے عالم گیر مسائل میں سیرتِ نبوی کی عملی رہنمائی وغیرہ، ایسے موضوعات ہیں جن پر کام ہونا چاہیے۔عربی کی طرح دعوت کے اصول ومنہج پر اردو میں قابل ذکر کتابیں موجود نہیں ہیں۔ یہ موضوع بھی توجہ کا متقاضی ہے۔

حواشی ومراجع

۱۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، زیر اہتمام دانش گاہ پنجاب لاہور (اشاعت:۱۹۷۵ء) ۱۱/۵۰۶-۵۰۷

۲۔ سیرت میں مختلف مناہج اور رجحانات کے لیے دیکھیں: محمود احمد غازی: محاضرات سیرت (چوتھا خطبہ: مناہج سیرت ص:۱۹۵-۲۵۳) اریب پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۲۰۱۰ء

۳۔ حسین ہیکل: حیاۃ محمد (اردو ترجمہ محمد مسعود عبدہ) فرید بک ڈپو دہلی، ۲۰۰۵ء ص:۸۶، ۸۵۵، ۶۶۲۔ ہیکل اسلامی تعلیمات اور عقل کے تناظر میں مسلم اور مغربی کے امتزاج کی بات کہتے ہیں اور مغربی تہذیب سے استفادے کو ناگزیر قرار دیتے ہیں۔ اس طرح ان کی نظر میں مغربی تہذیب اور اسلامی تہذیب میں بہت سے معاملوں میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے ص:۶۵۹

۴۔ ایضا، ص۸۱۳

۵۔ قاضی عیاض بن موسی :الشفاء بتعریف حقوق المصطفی ج:۱ص:۱۶۲، ۱۶۶، ۲۳۹،

مطبعہ مصطفیٰ البابی الحلبی واولادہ مصر، ۱۹۵۰ء

۶ ابن قیم: زاد المعادفی هدی خیر العباد ۱/۱۶۹، ۳/۳۴

۷ اس طرح کی کچھ عربی سائٹس یہ ہیں: nabialrahmah.com, mercyprophet.com, mercyprophet.org. nusraah.com, وغیرہ

۸ وهبه الزحیلی: منهج الدعوة فی السیرة النبویة، دار المکتبی للطباعة والنشر والتوزیع والتصدیر، القاهرة

۹ دیکھیے صفحات: ۱۶۸، ۱۸۲، ۱۸۴

۱۰ خطبات مدراس، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۸۸ء، ملاحظہ کیجیے صفحات: ۸۴، ۸۸، ۱۰۳، ۱۰۵ وغیرہ

۱۱ مثلاً مفتی محمد عبدہ، رشید رضا، حسین ہیکل وغیرہ دیکھیے حیاۃ محمد: ۶۹–۷۱

۱۲ خاتم النبیین، الموتمر العالمی الثالث للسیرة والسنة النبویة، ۱۴۰۰ھ، ص: ۶۵۱

۱۳ ایضا: ص ۶۷۴ ۱۴ ص ۳۲۵ ۱۵ ص ۱۴۶

۱۶ پیغمبر انسانیت، ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۱۸۱

۱۷ The Spirit of Islam, *Chatto & Windus(London)p.276* (1974)

۱۸ ابوالکلام آزاد: رسول رحمت ص: ۴۲۶

۱۹ طارق رمضان: *In the Footsteps of the Prophet (p.x)* Oxford University Press(2007) ،

۲۰ افضال الرحمان *The Muslim* Muhammad Blessing for Mankind, *Scholars Trust (London) pp.232-282*

۲۱ امیر علی: The Spirit of Islam یہ بات مصنف نے 'سیل' کے Essays on Islam کے حوالے سے نقل کی ہے۔ Part:2.P.272

۲۲ ایضا Part.2 ,Chap.7

۲۳ ڈاکٹر حمید اللہ: رسول اکرم کی سیاسی زندگی، تاج کمپنی دہلی، ۱۹۸۵ء، باب ۲۸، ص ۲۶۴–۲۶۵

۲۴ ایضاً ۲۵ ایضاً، ص ۲۶۸

۲۶ یٰسین مظہر صدیقی: نبوی اسوہ: مسلم اقلیتوں کے مسائل کا حل، ص: ۶۲ اسلامک بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی

۲۷ طارق رمضان: ص ۶۷ ۲۸ ایضاً، ملاحظہ کیجیے صفحات: ۷۶، ۷۸، ۸۳

۲۹ طارق رمضان، ص ۹۰ ۳۰ ۲/۳۳۶، ۳۷۰

۳۱ اس کی مثال کے طور پر دیکھیے، پیغمبر انسانیت ص: 143، محمد الغزالی: فقہ السیرۃ: ص: 125 وغیرہ

۳۲ خاتم النبیین، ص۶۵۳، ۶۹۷

۳۳ ابوزہرہ:نظریة الحرب فی الاسلام:ص۳۹مطبوعہ وزارۃ الاوقاف مصر،۲۰۰۸ء

۳۴ رسول رحمت،ص:۲۵۹،مسلم غیر مسلم تعلقات کے حوالے سے بھی مولانا آزاد کا نکتۂ نظر نہایت وسیع النظری پر مبنی ہے۔موالات کے تعلق سے انہوں نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ یہود ونصاری اور مشرکین سے موالات کی ممانعت قرآن میں صرف ان کی ان جماعتوں کے ساتھ خاص ہے جو محض دین کے اختلاف کی بنیاد پر مسلمانوں کے ساتھ برسر پیکار تھیں۔(ترجمان القرآن،ص۲/ ۱۴۵-۱۴۶)

۳۵ خاتم النبیین،ص۶۹۷ ۳۶ صحیح بخاری:۲۸۱۸، ۲۸۳۸؛ صحیح مسلم:۱۷۴۲

۳۷ سیرت النبی،۱/۱۸۲-۱۸۳

۳۸ مصطفیٰ السباعی: فقہ السیرۃ (اردو ترجمہ) ص:۳۷،انٹرنیشنل اسلامک بک سینٹر،کویت

۳۹ ایضاً،ص۱۳۸-۱۳۹

۴۰ ص۲۵،بحوالہ ظافر القاسمی:الجهاد والحقوق الدولية العامة فی الاسلام، دار العلم للملايين بيروت، ۱۹۸۲ء،ص۱۸۹

۴۱ حمید اللہ: محمد رسول اللہ، اردو ترجمہ: خالد پرویز، ملی پبلی کیشنز نئی دہلی،۲۰۱۰ء،ص۲۴۳

۴۲ حمید اللہ:عہد نبوی کے میدان جنگ،علمی مرکز راول پنڈی، پاکستان، ۱۹۹۸ء،ص۱۲۷

۴۳ حمید اللہ:محمد رسول اللہ،۱۸۲ ۴۴ حسین ہیکل،۳۹۰

۴۵ طارق رمضان،ص۵۲، ۵۳ ۴۶ افضال الرحمٰن،ص۱۶۴، ۱۶۵

۴۷ رحمۃ للعالمین، مکتبہ رحمت دیوبند،۲/۲۶۵،مصنف کے مطابق عہد نبوی کے غزوات وسرایا میں کل مرنے والوں کی تعداد۱۰۱۸ (جس میں کفار مقتولین کی تعداد۷۵۹) زخمیوں کی تعداد (جس کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ اس میں کمی بیشی کا امکان ہے)۱۲۷، اور قیدیوں کی تعداد۶۵۶۵ ہے،جس میں ایک مسلم قیدی شامل ہے۔ظاہر ہے، یہ ان کی تحقیق ومطالعے کا نتیجہ ہے،جس میں کمی بیشی ہوسکتی ہے، لیکن بہر حال ان اعداد وشمار کی بنیاد پر اس تعلق سے ایک مجموعی اندازہ ضرور قائم کیا جاسکتا ہے۔

۴۸ نبی الرحمۃ: الرسالۃ والانسان، الزہراء للاعلام العربی، قاہرۃ ۲۰۰۷ء

۴۹ الرسالۃ والرسول،ص۹۰ ۵۰ سیرت النبی،ص۱۲

۵۱ ایضاً،ص۲۲ ۵۲ خاتم النبیین،ص۶۵۲-۶۵۳

۵۳ فقہ السیرۃ (محمد الغزالی)،ص۵۸، خاتم النبیین (ابوزہرہ) ص۱۸۵، طارق رمضان وغیرہ

☆☆☆

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا تفسیری منہج

——————— جناب ظفر احمد الاثری (لندن)

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی تفسیر 'تفہیم القرآن' بیسویں صدی عیسوی میں اردو زبان میں لکھی جانے والی اہم تفاسیر میں سے ہے۔ مولانا نے اس کی تالیف میں نہ صرف قدیم مفسرین سے استفادہ کیا ہے، بلکہ جدید علوم اور عصری معلومات سے بھی بھرپور فائدہ اٹھایا ہے اور جدید ذہن کو مطمئن کرنے اور اس کے اعتراضات و اشکالات کا جواب فراہم کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ زیرنظر مقالہ میں تفہیم القرآن کے اقتباسات کی روشنی میں مولانا کے تفسیری منہج کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ اس تفسیر کے امتیازات و خصائص، فنّی خوبیوں اور عصری معنویت کا مبسوط اور تحقیقی مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔ (رضی الاسلام)

مولانا سید ابوالاعلی مودودیؒ (۱۹۰۳-۱۹۷۹ء) نے جہاں اپنی ولولہ انگیز تحریروں سے مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کی کوشش کی وہیں انھوں نے قرآن پاک کی تفسیر لکھنے کا فیصلہ کیا، تاکہ لوگوں کو قرآن کریم کا فہم حاصل ہو اور اس کی روح اور اس کا حقیقی مدعا ان تک پہنچ سکے۔ وہ تفہیم القرآن کے دیباچہ میں فرماتے ہیں: ''میں ایک مدت سے محسوس کر رہا تھا کہ ہمارے عام تعلیم یافتہ لوگوں میں روح قرآن تک پہنچنے اور اس کتاب پاک کے حقیقی مدعا سے روشناس ہونے کی جو طلب پیدا ہوگئی ہے اور روز بروز بڑھ رہی ہے وہ مترجمین و مفسرین کی قابل قدر مساعی کے باوجود ہنوز تشنہ ہے۔ اس کے ساتھ میں یہ احساس بھی اپنے اندر پا رہا تھا کہ اس تشنگی کو بجھانے کے لیے کچھ نہ کچھ خدمت میں بھی کرسکتا ہوں۔ انہی دونوں احساسات نے مجھے اس کوشش پر مجبور کیا''۔ (تفہیم القرآن، جلد اول)

یوں تو قرآن مجید کی تفسیریں ہر زمانہ میں مختلف زبانوں میں لکھی گئی ہیں اور وہ اپنے اپنے زمانہ کی ضرورت پوری کرتی رہی ہیں، لیکن موجودہ زمانے میں، جب کہ ذہنوں کو جدید علوم،

سائنس اور ٹکنالوجی نے مسخر کرلیا ہے، ایک ایسی تفسیر کی ضرورت تھی جو اعلیٰ معیاری زبان میں ہو اور ساتھ ہی وہ دل ودماغ میں پیدا ہونے والے تمام شکوک وشبہات کا جواب بھی فراہم کرتی ہو۔ مولانا مودودیؒ نے وقت کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے قرآن کی ایسی تفسیر لکھی کہ اس کے مطالعہ سے ذہن میں ابھرنے والے تمام سوالات کا اطمینان بخش جواب مل جاتا ہے۔ عقل پرست لوگ اسلام اور شریعت کے مختلف مسائل پر جو طرح طرح کے سوالات اور اعتراضات کرتے ہیں، مولانا نے اس تفسیر میں ان کا بڑا مسکت جواب فراہم کیا ہے۔ اس تفسیر میں احادیث، سیرتِ نبوی اور اسوۂ صحابہ وصحابیات کی روشنی میں قرآن پاک کی بہترین تشریح کی گئی ہے۔

اس تفسیر میں مولانا نے صحف سماوی سے استشہاد کے ساتھ ان مواقع اور مباحث کی بھی نشان دہی کی ہے جن میں تحریف یا ردوبدل کردیا گیا ہے، ساتھ ہی ان میں موجود تضادات کو بھی واضح کیا ہے۔ یہ تفسیر مستشرقین اور عیسائی مشنریوں کی غلط بیانیوں کا بھی مدلل جواب ہے۔

تفسیری منہج

مولانا مودودیؒ ہر سورہ کے دیباچہ میں مضمون یا موضوع ومباحث کے عنوان کے تحت بہت مربوط انداز میں اس سورہ کا خلاصہ اور تجزیہ پیش کرتے ہیں، جس سے پوری سورہ کا مرکزی مضمون ذہن میں بیٹھ جاتا ہے۔ بعض سورتوں کے درمیان معنوی اور موضوعی مناسبت اور ربط بیان کرتے ہیں۔ کہیں کہیں سورہ کا تجزیہ آیتوں کا گروپ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ یہ اسلوب خاص طور پر سورۂ ملک سے اخیر تک بیش تر سورتوں کی تفسیر میں نظر آتا ہے۔ سورہ کے دیباچہ میں اور دورانِ تفسیر بھی مولانا اس کی تعیین کرتے ہیں کہ یہاں کن لوگوں سے خطاب کیا جارہا ہے۔ سورتوں کے آغاز میں وہ بتاتے ہیں کہ یہ نام کیوں اور کہاں سے ماخوذ ہے، پھر زمانۂ نزول بیان کرتے ہیں، اس کے ساتھ اجزائے مضمون کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ اگر وہ سورہ مختلف اوقات میں نازل ہوئی ہے تو اس کا ذکر کرکے ان اوقات کو متعین کرتے ہیں۔ زمانۂ نزول بیان کرنے کے بعد شانِ نزول بیان کرتے ہیں۔ اس ضمن میں سورتوں کا پس منظر پیش کرتے ہیں، جس میں احادیث اور تاریخ کی کتابوں کی مدد سے طویل گفتگو کرتے ہیں اور سورتوں سے متعلق سارے حقائق پیش کرتے ہیں، جن سے سورتوں کو سمجھنے میں بہت آسانی

ہوتی ہے۔ بعض وقت شانِ نزول سے پہلے خطاب اور مباحث کے تحت سورہ کا خطاب کن لوگوں سے ہے؟ اس کی طرف اشارہ کرتے ہیں، جیسا کہ سورۂ آل عمران میں ہے اور کبھی شانِ نزول اور مباحثِ سورہ کو ایک ساتھ ذکر کرتے ہیں، مثلاً سورۂ نساء کے دیباچہ میں۔ اس سے سورہ کے مضامین کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ کبھی شان نزول اور مباحث (یعنی مضامینِ سورہ) کو الگ الگ موضوع بنا کر بیان کرتے ہیں، جیسا کہ انھوں نے سورۂ المائدۃ اور سورۂ الانعام کے دیباچوں میں کیا ہے۔ تاریخی پس منظر کا ذکر انھوں نے ۲۳ سورتوں میں کیا ہے۔ اس کے علاوہ تمام سورتوں کے دیباچوں میں نام، زمانۂ نزول، پھر موضوع اور مباحث کا ذکر ہے، صرف چند سورتوں میں اس سے مختلف اسلوب ہے۔ مثلاً سورۂ توبہ میں نام، بسم اللہ نہ لکھنے کی وجہ، زمانۂ نزول اور اجزاء سورہ سے بحث کرنے کے بعد تاریخی منظر کا تذکرہ کیا ہے، پھر عرب کی تسخیر، غزوۂ تبوک، مسائل و مباحث کا ذکر ہے۔ سورۂ یوسف میں زمانہ وسببِ نزول بیان کرنے کے بعد مقاصدِ نزول کو بیان کیا ہے۔ اس کے بعد مباحث و مسائل اور تاریخی و جغرافی حالات کا ذکر کیا ہے۔

سورتوں کا زمانۂ نزول

مولانا مودودیؒ سورتوں کا زمانۂ نزول بسا اوقات احکام اور واقعات کی روشنی میں طے کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر سورۂ نساء کے زمانۂ نزول کے بارے میں فرماتے ہیں:

''یہ سورہ متعدد خطبوں پر مشتمل ہے، جو غالباً ۳ ہجری کے اواخر سے لے کر ۴ ہجری کے اواخر یا ۵ ہجری کے اوائل تک مختلف اوقات میں نازل ہوئے ہیں۔ اگرچہ یہ تعین کرنا مشکل ہے کہ کس مقام سے کس مقام تک کی آیات ایک سلسلۂ تقریر میں نازل ہوئیں تھیں اور ان کا ٹھیک زمانۂ نزول کیا ہے، لیکن بعض احکام اور واقعات کی طرف بعض اشارے ایسے ہیں جن کے نزول کی تاریخیں ہمیں روایات سے معلوم ہو جاتی ہیں، اس لیے ان کی مدد سے ہم ان مختلف تقریروں کی ایک سرسری سی حد بندی کر سکتے ہیں، جن میں یہ احکام اور یہ اشارے واقع ہوئے ہیں۔ مثلاً ہمیں معلوم ہے کہ وراثت کی تقسیم اور یتیموں کے حقوق کے متعلق ہدایات جنگ احد کے بعد نازل ہوئیں تھیں، جب کہ مسلمانوں کے ستر آدمی شہید ہو گئے تھے اور مدینہ کی چھوٹی سی بستی میں اس حادثے کی وجہ سے بہت سے گھروں میں یہ سوال پیدا ہو گیا تھا کہ شہداء کی میراث کس طرح تقسیم کی جائے اور جو یتیم بچے انہوں نے چھوڑے ہیں

ان کے مفاد کا تحفظ کیسے ہو۔ اس بنا پر ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ ابتدائی چار رکوع اور پانچویں رکوع کی پہلی تین آیتیں اسی زمانہ میں نازل ہوئی ہوں گی۔ (تفہیم القرآن، سورہ نساء، جلد اول)

مولانا مودودیؒ مکی سورتوں کے زمانۂ نزول کو ان کے مضامین اور اندازِ بیان پر غور کر کے یا روایات کی روشنی میں اور سورتوں کی اندرونی شہادت کو سامنے رکھ کر طے کرتے ہیں۔ رہیں مدنی سورتیں تو ان کا زمانہ آسانی سے معلوم ہو جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں:

''جہاں تک مدنی سورتوں کا تعلق ہے ان میں سے تو قریب قریب ہر ایک کا زمانہ معلوم ہے، یا تھوڑی سی کاوش سے متعین کیا جا سکتا ہے، بلکہ ان کی بہ کثرت آیتوں کی انفرادی شانِ نزول تک معتبر روایات میں مل جاتی ہے، لیکن مکی سورتوں کے متعلق ہمارے پاس اتنے مفصل ذرائع موجود نہیں ہیں۔ بہت کم سورتیں یا آیتیں ایسی ہیں جن کے زمانۂ نزول اور موقع نزول کے بارے میں کوئی صحیح و معتبر روایت ملتی ہو، کیونکہ اس زمانہ کی تاریخ اس قدر جزئی تفصیلات کے ساتھ مرتب نہیں ہوئی ہے جیسی مدنی دور کی تاریخ ہے۔ اس وجہ سے مکی سورتوں کے معاملہ میں ہم کو تاریخی شہادتوں کے بجائے زیادہ تر ان اندرونی شہادتوں پر اعتماد کرنا پڑتا ہے جو مختلف سورتوں کے موضوع، مضمون اور انداز بیان میں اور اپنے پس منظر کی طرف ان کے جلی یا خفی اشارات میں پائی جاتی ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اس نوعیت کی شہادتوں سے مدد لے کر ایک ایک سورہ اور ایک ایک آیت کے متعلق یہ تعین نہیں کیا جا سکتا کہ یہ فلاں تاریخ کو یا فلاں سنہ میں فلاں موقع پر نازل ہوئی ہے۔ زیادہ صحت کے ساتھ جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ ایک طرف ہم مکی سورتوں کی اندرونی شہادتوں کو، اور دوسری طرف نبی ﷺ کی مکی زندگی کی تاریخ کو آمنے سامنے رکھیں اور پھر دونوں کا تقابل کرتے ہوئے یہ رائے قائم کریں کہ کون سی سورہ کس دور سے تعلق رکھتی ہے۔ (سورہ الانعام، جلد اول)

اسی طرح اگر کسی سورہ کے بارے میں متعدد روایات منقول ہیں تو وہاں مولانا تمام روایتیں جمع کر کے ان کی روشنی میں زمانۂ نزول متعین کرتے ہیں۔ اس کی مثال سورۂ رحمان ہے، جس میں انھوں نے پہلے تمام روایتیں جمع کر دی ہیں، پھر ان کا تجزیہ کر کے اپنی رائے پیش کی ہے۔

خطاب کی تعیین

خطاب کی تعیین سے آیات کا مفہوم سمجھنے اور حالات پر ان کا انطباق کرنے میں مدد

ملتی ہے۔ اگر خطاب کی تعیین صحیح نہ ہو تو آیات کے معانی اور مفہوم کو سمجھنے میں دشواری پیش آسکتی ہے اور ان کی صحیح تاویل مشکل ہو جاتی ہے۔ مولانا مودودیؒ نے اپنی تفسیر کے دوران اور سورت کے دیباچہ میں بھی اس بات کی وضاحت کی ہے کہ کن لوگوں سے سورت میں خطاب کیا گیا ہے۔ وہ تعیین کرتے ہیں کہ خطاب کہاں سے شروع ہو رہا ہے اور کہاں ختم ہو رہا ہے۔ اسی طرح وہ بدلتے ہوئے خطاب کی بھی نشان دہی کرتے ہیں، مثلاً سورہ بقرہ آیت ۴۰ کی تشریح میں لکھتے ہیں: ''پچھلے چار رکوعوں میں تمہیدی تقریر تھی، جس کا خطاب تمام انسانوں کی طرف تھا۔ اب یہاں سے، یعنی (اے بنی اسرائیل! ذرا خیال کرو میری اس نعمت کا جو میں نے تم کو عطا کی تھی) چودھویں رکوع تک مسلسل ایک تقریر اس قوم کو خطاب کرتے ہوئے چلتی ہے جس میں کہیں کہیں عیسائیوں اور مشرکین عرب کی طرف بھی کلام کا رخ پھر گیا ہے اور موقع موقع سے ان لوگوں کو بھی خطاب کیا گیا ہے جو حضرت محمد ﷺ کی دعوت پر ایمان لائے تھے۔ (تفہیم القرآن، سورہ بقرہ، جلد اول، حاشیہ ۵۶)

سورۂ حج میں تین مختلف گروہوں سے خطاب کیا گیا ہے۔ اس سورہ کے دیباچہ میں مولانا لکھتے ہیں: ''اس سورہ میں تین گروہ مخاطب ہیں: مشرکین مکہ، مذبذب اور متردد مسلمان اور مومنین صادقین۔ مشرکین سے خطاب کی ابتدا مکے میں کی گئی اور مدینہ میں اس کا سلسلہ پورا کیا گیا۔ اس خطاب میں ان کو پورے زور کے ساتھ متنبہ کیا گیا..... مذبذب مسلمان، جو خدا کی بندگی قبول تو کر چکے تھے، مگر اس راہ میں کوئی خطرہ برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھے، ان کو خطاب کرتے ہوئے سخت سرزنش کی گئی ہے..... اہل ایمان سے خطاب دو طریقوں پر کیا گیا ہے۔ ایک خطاب ایسا ہے جس میں وہ خود بھی مخاطب ہیں اور عرب کی رائے عام بھی اور دوسرے خطاب میں صرف اہل ایمان مخاطب ہیں۔ پہلے خطاب میں مشرکین مکہ کی اس روش پر گرفت کی گئی کہ انہوں نے مسلمانوں کے لیے مسجد حرام کا راستہ بند کر دیا ہے..... دوسرے خطاب میں مسلمانوں کو قریش کے ظلم کا جواب طاقت سے دینے کی اجازت عطا کی گئی ہے۔'' (تفہیم القرآن، دیباچہ سورہ حج)

قرآن کریم میں خطاب جیسے جیسے بدلتا ہے موضوع بھی بدلتا ہے اور انداز اور اسلوب بھی۔ اس کی وضاحت مولانا مودودیؒ نے سورۂ اعراف کے دیباچہ میں بہت اچھی طرح

کی ہے۔ فرماتے ہیں: ''اس سورہ کا مرکزی مضمون دعوتِ رسالت ہے۔ ساری گفتگو کا مدعا یہ ہے کہ مخاطبوں کو خدا کے فرستادہ پیغمبر کی پیروی اختیار کرنے پر آمادہ کیا جائے۔ لیکن اس دعوت میں انذار (تنبیہ اور ڈراوے) کا رنگ زیادہ نمایاں پایا جاتا ہے، کیونکہ جو لوگ مخاطب ہیں (یعنی اہل مکہ) انہیں سمجھاتے سمجھاتے ایک طویل زمانہ گزر چکا ہے اور ان کی گراں گوشی، ہٹ دھرمی اور مخالفانہ ضد اس حد کو پہنچ چکی ہے کہ عن قریب پیغمبر کو ان سے مخاطبہ بند کر کے دوسروں کی طرف رجوع کرنے کا حکم ملنے والا ہے۔ اس لیے تفہیمی انداز میں قبول رسالت کی دعوت کے ساتھ ان کو یہ بھی بتا جا رہا ہے کہ جو روش تم نے اپنے پیغمبر کے مقابلہ میں اختیار کر رکھی ہے ایسی روش پہلے کی قومیں اپنے پیغمبروں کے مقابلہ میں اختیار کر کے بہت برا انجام دیکھ چکی ہے۔ پھر چونکہ ان پر حجت تمام ہونے کے قریب آ گئی ہے اس لیے تقریر کے آخری حصہ میں دعوت کا رخ ان سے ہٹ کر اہل کتاب کی طرف پھر گیا ہے اور ایک جگہ تمام دنیا کے لوگوں سے عام خطاب کیا گیا ہے، جو اس بات کی علامت ہے کہ اب ہجرت قریب ہے اور وہ دور، جس میں نبی کا خطاب تمام تر اپنے قریب کے لوگوں سے ہوا کرتا ہے، خاتمہ پر آ لگا ہے۔

دورانِ تقریر میں چونکہ خطاب کا رخ یہود کی طرف بھی پھر گیا ہے اس لیے ساتھ ساتھ دعوتِ رسالت کے اس پہلو کو بھی واضح کر دیا گیا کہ پیغمبر پر ایمان لانے کے بعد اس کے ساتھ منافقانہ روش اختیار کرنے، اور سمع و طاعت کا عہد استوار کرنے کے بعد اسے توڑ دینے، اور حق و باطل کی تمیز سے واقف ہو جانے کے بعد باطل پرستی میں مستغرق رہنے کا انجام کیا ہے۔ (تفہیم القرآن، دیباچہ سورۂ اعراف)

قرآن میں کبھی خطاب نبی سے ہوتا ہے، مگر اصل مقصود دوسروں کو سنانا ہوتا ہے، مثلاً سورہ یونس آیت ۹۴ میں مولانا نے لکھا ہے: ''یہ خطاب بظاہر نبی ﷺ سے ہے، مگر دراصل بات ان لوگوں کو سنانی مقصود ہے جو آپ کی دعوت میں شک کر رہے ہیں۔ اور اہل کتاب کا حوالہ اس لیے دیا گیا ہے کہ عرب کے عوام تو آسمانی کتابوں کے علم سے بے بہرہ تھے، ان کے لیے یہ آواز ایک نئی آواز تھی، مگر اہل کتاب کے علماء میں سے جو لوگ متدیّن اور منصف مزاج تھے وہ اس امر کی تصدیق کر سکتے تھے کہ جس چیز کی دعوت قرآن دے رہا ہے یہ وہی چیز ہے جس کی دعوت تمام پچھلے انبیاء دیتے رہے ہیں''۔ (تفہیم القرآن، جلد دوم، سورہ یونس حاشیہ ۹۶)

قرآن مجید میں مختلف مواقع پر مسلمانوں کو خطاب کرکے کہا ہے کہ ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو''۔ اس سے کون سے مسلمان مراد ہیں؟ مولانا مودودیؒ کہتے ہیں کہ سیاق و سباق اور سلسلۂ کلام کے ذریعہ اس کی تعیین ہوتی ہے۔ سورۂ احزاب کے حاشیہ ۱۱۸ میں انھوں نے لکھا ہے: ''یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ قرآن مجید میں 'اے لوگو جو ایمان لائے ہو' کے الفاظ سے کہیں سچے اہل ایمان کو خطاب کیا گیا ہے اور کہیں مسلمانوں کی جماعت بحیثیت مجموعی مخاطب ہے، جس میں مومن اور منافق اور ضعیف الایمان سب شامل ہیں اور کہیں روئے سخن خالص منافقین ہی کی طرف ہے۔ منافقین اور ضعیف الایمان لوگوں کو الذین آمنوا کہہ کر جب مخاطب کیا جاتا ہے تو اس سے مقصود ان کو شرم دلانا ہوتا ہے کہ تم لوگ دعوی تو ایمان لانے کا کرتے ہو اور حرکتیں تمہاری یہ کچھ ہیں۔ سیاق و سباق پر غور کرنے سے بہ آسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ کس جگہ الذین آمنوا سے مراد کون لوگ ہیں۔ یہاں سلسلۂ کلام صاف بتا رہا ہے کہ مخاطب عام مسلمان ہیں۔'' (تفہیم القرآن، جلد۴، سورہ احزاب، حاشیہ ۱۱۸)

شان نزول

شان نزول کا کیا مطلب ہوتا ہے؟ اس کی وضاحت مولانا مودودیؒ نے سورۂ دہر کے دیباچہ میں اس طرح کی ہے:

''شان نزول کے بارے میں بہت سی روایات کا حال یہی ہے کہ کسی آیت کے متعلق جب یہ کہا جاتا ہے کہ یہ فلاں موقع پر نازل ہوئی تھی تو دراصل اس سے مراد یہ نہیں ہوتی ہے کہ جب یہ واقعہ پیش آیا اسی وقت یہ آیت نازل ہوئی تھی، بلکہ مراد یہ ہوتی ہے کہ یہ آیت اس واقعہ پر چسپاں ہوتی ہے۔ امام سیوطیؒ نے اتقان میں حافظ ابن تیمیہؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ''راوی جب یہ کہتے ہیں کہ یہ آیت فلاں معاملہ میں نازل ہوئی ہے تو کبھی اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وہی معاملہ اس کے نزول کا سبب ہے اور کبھی اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ معاملہ اس آیت کے حکم میں داخل ہے، اگرچہ وہ اس کے نزول کا سبب نہ ہو'' آگے چل کر وہ امام بدرالدین زرکشیؒ کا قول ان کی کتاب 'البرہان فی علوم القرآن' سے نقل کرتے ہیں کہ ''صحابہ اور تابعین کی یہ عادت معروف ہے کہ ان میں سے کوئی شخص جب یہ کہتا ہے کہ یہ آیت فلاں معاملہ میں نازل ہوئی تھی تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ اس آیت کا حکم اس معاملہ پر چسپاں

ہوتا ہے، نہ یہ کہ وہی اس واقعہ کے نزول کا سبب ہے۔ پس دراصل اس کی نوعیت آیت کے حکم سے استدلال کی ہوتی ہے نہ کہ بیان واقعہ کی"(الاتقان فی علوم القرآن، جلد اول ،صفحہ ۳۱ ،طبع ۱۹۲۹ء)۔ (تفہیم القرآن، سورۂ دہر، جلد ششم)

شانِ نزول کے سلسلے میں یہی بات مولانا حمید الدین فراہیؒ نے بھی مقدمہ تفسیر نظام القرآن میں کہی ہے اور انھوں نے بھی امام زرکشیؒ کا حوالہ دیا ہے۔

قرآن کی تاویل کا صحیح طریقہ

اس ضمن میں مولانا مودودیؒ لکھتے ہیں کہ ''سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ آپ قرآن کی تاویل وتعبیر کا صحیح طریقہ اچھی طرح سمجھ لیں۔آپ جس آیت کے معنیٰ سمجھنا چاہتے ہوں پہلے عربی زبان کے لحاظ سے اس کے الفاظ اور ترکیب (Construction) پر غور کریں، پھر اسے سیاق وسباق (Context) میں رکھ کر دیکھیں، پھر اسی مضمون سے تعلق رکھنے والی جو دوسری آیات قرآن میں مختلف مقامات پر موجود ہیں ان کو جمع کر کے دیکھیں کہ زیر بحث آیت کی ممکن تعبیرات میں سے کون سی تعبیر ان سے مطابقت رکھتی ہے اور کون سی تعبیرات ان سے خلاف پڑتی ہے (اور یہ ظاہر ہے کہ ایک قائل کا کوئی قول اگر دو یا زائد تعبیرات کا متحمل ہو تو اس کی وہی تعبیر معتبر سمجھی جائے گی جو اسی مضمون کے متعلق اس کی دوسری تصریحات سے مطابقت رکھتی ہو) اس حد تک قرآن کا مطلب خود قرآن سے معلوم کرنے کوشش جب آپ کر لیں تو اس کے بعد یہ بھی دیکھئے کہ جو شخص دراصل اس قرآن کو پیش کرنے والا تھا اس کے قول وعمل سے قرآن کی زیرِ بحث آیت کے مفہوم پر کیا روشنی پڑتی ہے اور جو لوگ اس کے قریب ترین زمانہ میں اس کے پیرو تھے وہ اس آیت کا کیا مطلب سمجھتے تھے''۔ (رسائل ومسائل، جلد سوم، ص ۱۶)

قرآن کی تاویل میں حدیث کی اہمیت

حدیث، شریعت کا دوسرا ماخذ ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی پوری زندگی قرآن کی تفسیر تھی۔حضرت عائشہؓ کا مشہور قول ہے کہ ''قرآن آپؐ کا اخلاق تھا''۔اس سے مترشح ہوتا ہے کہ آپؐ کی پوری زندگی قرآن کی بہترین تفسیر ہے۔مولانا مودودیؒ نے اپنی تفسیر میں رسول اللہ

ﷺ کی زندگی کے ہر پہلو سے قرآن کی تفسیر بیان کی ہے۔ آپؐ کی حیات طیبہ سے قرآن کی تفسیر بیان کرنا اور احادیثِ رسول اور تاریخی شواہد سے استشہاد کرنا اس تفسیر کی بہت بڑی خوبی ہے۔ قرآن کی تفسیر وتاویل میں حدیث کی اہمیت کے بارے میں مولانا فرماتے ہیں:

''میں کہتا ہوں کہ ایک شخص خواہ قرآن کو محمد ﷺ کی تصنیف سمجھتا ہو یا یہ سمجھتا ہو کہ یہ خدا کی کتاب ہے اور محمد ﷺ خدا کے رسول ہیں، دونوں صورتوں میں اس کا یہ دعوی کرنا غلط ہوگا کہ اسے قرآن کو سمجھنے کے لئے محمد ﷺ کے قولی وعملی تشریح سے مدد لینے کی کوئی حاجت نہیں ہے۔ اگر وہ اسے آں حضرت کی تصنیف سمجھتا ہے تو اسے ماننا ہوگا کہ مصنف نے اس کی جو تشریح بھی کی ہو وہی اس کا اصل مدعا ہے۔ اور اگر وہ اسے خدا کا کلام مانتا ہے اور یہ تسلیم کرتا ہے کہ خدا ہی نے اس کی تعلیم دینے کے لئے محمد ﷺ کو مامور کیا تھا تب بھی اسے یہ ماننا پڑے گا کہ خدا کے کلام کا جو مفہوم محمد ﷺ نے سمجھا ہے وہی اس کا مستند مفہوم ہے۔ یہ ایک الگ بحث ہے کہ کوئی حدیث جو محمد ﷺ کی طرف منسوب کی جاتی ہو، صحیح ہے یا نہیں اور اس کے صحیح ہونے یا نہ ہونے کے دلائل کیا ہیں، مگر بجائے خود یہ بات نا قابلِ انکار ہے کہ قرآن کو سمجھنے میں ہم حدیث سے بے نیاز نہیں ہو سکتے''۔ (رسائل ومسائل، جلد سوم)

قرآن وحدیث کے باہمی ربط کے بارے میں وہ ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں: ''حدیث قرآن کی جس طرح تشریح کرتی ہے اس کی مثالوں میں سے چند یہ ہیں: قرآن کہتا ہے کہ چور کا ہاتھ کاٹا جائے، اس میں چوری کی کوئی حد مقرر نہیں کی گئی ہے، حتی کہ اگر اپنا بچہ ایک پیسہ آپ کی جیب سے نکال لے تو وہ بھی چور قرار دیا جاسکتا ہے۔ ہاتھ کی بھی کوئی حد نہیں بتائی گئی ہے، سیدھا یا بایاں، ؟ کلائی کے پاس سے یا شانے کے پاس سے یا کہنی کے پاس سے؟ ان سب امور کے متعلق سارے تعیّنات حدیث میں کیے گئے ہیں۔ انہیں آپ نظر انداز کر دیں تو اندازہ کر لیجیے کہ حکم کی تعمیل میں کیسی کچھ زیادتیاں ہوسکتی ہیں۔ قرآن حج کی فرضیت کا عام حکم دیتا ہے اور یہ صراحت نہیں کرتا کہ آیا ہر سال ہر مستطیع مسلمان پر فرض ہے یا عمر میں ایک مرتبہ ادا کرنا کافی ہے؟ مؤخر الذکر بات صرف حدیث سے معلوم ہوسکتی ہے۔ اگر آپ اسے قبول نہ کریں تو قرآنی حکم کے عموم کا تقاضا یہ ہے کہ ہر سال ہر مستطیع مسلمان حج کے لیے جائے۔ قرآن چند اقسام کی عورتوں کو حرام قرار دینے کے بعد کہتا ہے کہ ان کے ما سوا دوسری عورتوں سے نکاح کرنا تمہارے لئے حلال ہے۔ ان حرام کی ہوئی عورتوں میں محرّ مات ابدیہ

کے علاوہ صرف سالی کا ذکر ہے، جبکہ اس کی بہن آدمی کے نکاح میں زندہ موجود ہو، عورت کی خالہ اور پھوپھی کا ذکر نہیں ہے۔ یہ بات حدیث سے معلوم ہوتی ہے کہ عورت کی اپنی بہن کی طرح اس کے باپ کی بہن اور اس کی ماں کی بہن بھی اس کے ساتھ ایک شخص کے نکاح میں جمع نہیں ہوسکتیں۔ اس تشریح کو نظر انداز کیا جائے تو آدمی حکم کے عموم سے غلط اٹھا کر وہی خرابی برپا کرسکتا ہے جس سے روکنے کے لیے شریعت نے جمع بین الاختین کو حرام کیا ہے۔ قرآن سونے اور چاندی کے جمع کر رکھنے پر سخت وعید کرتا ہے۔ سورۂ توبہ کی آیت ۳۵، ۳۶ کے الفاظ ملاحظہ فرمالیں۔ اس کے عموم میں اتنی گنجائش بھی نہیں ہے کہ آپ سونے یا چاندی کا ایک تار بھی رکھ سکیں۔ یہ حدیث ہی ہے جس نے اس کے منشا کی توضیح وتشریح کی ہے۔ قرآن میں کسی حکم کا نہ ہونا اور حدیث میں ہونا یہ معنی رکھتا ہے کہ حدیث قرآن سے زائد ایک حکم بیان کرتی ہے نہ یہ کہ حدیث قرآن کے مخالف حکم دے رہی ہے۔ مثلاً نماز کی رکعات اور اس میں پڑھی جانے والی عبارات اور نماز کی دوسری تفصیلات قرآن میں نہیں ہیں۔ حج کے تمام مناسک قرآن میں بیان نہیں ہوئے ہیں۔ زکوٰۃ کا نصاب اور اس کی شرحیں اور دوسری تفصیلات قرآن میں نہیں ہیں۔ اذان کے الفاظ قرآن میں نہیں ہیں۔ اس طرح کے جتنے زائد احکام ہم کو حدیث سے ملتے ہیں وہ قرآن سے زائد ضرور ہیں، مگر اس کے خلاف نہیں ہیں۔ قرآن کے خلاف ہونا یہ ہے قرآن ایک چیز کا حکم دے اور حدیث اس سے منع کرے، یا اس کے برعکس قرآن منع کرے اور حدیث اس کا حکم دے، ایسی کوئی مثال کسی صحیح حدیث میں نہیں پائی جاتی''۔ (رسائل ومسائل، حصہ سوم، ص ۱۸۰-۱۸۱)

قرآن میں مضامین کی تکرار

مولانا مودودیؒ سورتوں کے دیباچہ میں جہاں سورتوں کا تجزیہ کرتے اور ان کے مباحث اور مضامین بیان کرتے ہیں وہیں اگر کوئی سورہ مضمون کے اعتبار سے کسی دوسری سورہ سے مشابہ ہے تو اس کا ذکر کرکے سورتوں کے مابین مناسبت اور ربط قائم کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ سورۂ قیامہ، سورۂ دہر، سورۂ مرسلات، سورۂ نبا اور سورۂ نازعات کو ایک ہی مضمون کی سورتیں قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں: ''سورۂ قیامہ سے سورۂ نازعات تک سب کا مضمون ایک دوسرے سے مشابہ ہے، یعنی قیامت اور آخرت کا اثبات اور اس کو ماننے اور نہ ماننے کے نتائج

سے لوگوں کو خبردار کرنا''۔ (تفہیم القرآن، جلد ششم، سورہ نبا)

دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ ''سورۂ قیامہ اور سورۂ دہر اور اس کے بعد کی دو سورتیں سورۂ نبأ اور سورۂ نازعات اگر ملا کر پڑھی جائیں تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب ایک ہی دور کی نازل شدہ سورتیں ہیں اور ایک ہی مضمون ہے جن کو ان میں مختلف پیرایوں میں اہل مکہ کے ذہن نشین کرایا گیا ہے'' (تفہیم القرآن، جلد ششم، سورۂ المرسلات) سورۂ نبأ میں فرماتے ہیں: ''سورۂ قیامہ سے سورۂ نازعات تک سب کا مضمون ایک دوسرے سے مشابہ ہے'' (تفہیم القرآن، جلد ششم، سورۂ نبأ)

اسی طرح مولانا سورۃ الشّمس اور سورۃ اللیل کو مشابہ قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ سورۃ اللیل کے دیباچہ میں فرماتے ہیں: ''اس کا مضمون سورۃ الشّمس سے اس قدر مشابہ ہے کہ یہ دونوں سورتیں ایک دوسرے کی تفسیر محسوس ہوتی ہیں۔ ایک ہی بات، جسے سورۂ شمس میں ایک طریقہ سے سمجھا گیا ہے اور اس سورہ میں دوسرے طریقہ سے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دونوں قریب قریب ایک ہی زمانے میں نازل ہوئی ہیں''۔ مولانا دونوں سورتوں کے مضامین کی بھی وضاحت کرتے ہیں، چنانچہ سورۃ الشّمس کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ ''اس کا موضوع نیکی اور بدی کا فرق سمجھانا ہے اور ان لوگوں کو برے انجام سے ڈرانا ہے جو اس فرق کو سمجھنے سے انکار اور بدی کی راہ چلنے پر اصرار کرتے ہیں''۔ (تفہیم القرآن، جلد ششم، سورۂ شمس)

اور سورۃ اللیل کے بارے میں فرماتے ہیں: ''اس کا موضوع زندگی کے دو مختلف راستوں کا فرق اور ان کے انجام اور نتائج کا اختلاف بیان کرنا ہے''۔ (تفہیم القرآن، جلد ششم، سورۃ اللیل)

اسی طرح سورۃ الضحیٰ اور سورۂ الم نشرح کا زمانہ قریب قریب ایک اور ان کا مضمون ملتا جلتا قرار دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں: ''اس کا (سورۂ الم نشرح کا) مضمون سورۂ ضحیٰ سے اس قدر ملتا جلتا ہے کہ یہ دونوں سورتیں قریب قریب ایک ہی زمانہ اور ایک ہی جیسے حالات میں نازل شدہ معلوم ہوتی ہیں۔ (تفہیم القرآن، جلد ششم، سورۃ الانشراح) اور سورۃ الضحیٰ کے بارے میں لکھتے ہیں: ''اس کا موضوع رسول اللہ ﷺ کو تسلی دینا اور مقصد اس پریشانی کو دور کرنا ہے جو نزولِ وحی کا سلسلہ رک جانے سے آپ کو لاحق ہوگئی تھی''۔ اور سورۂ الم نشرح کے بارے میں

بیان کرتے ہیں کہ اس کا مقصد اور مدعا بھی رسول اللہ ﷺ کو تسلی دینا ہے۔ نبوت سے پہلے حضور کو کبھی ان حالات سے سابقہ پیش نہیں آیا تھا جن کا سامنا نبوت کے بعد دعوت اسلامی کا آغاز کرتے ہوئے آپ کو کرنا پڑا۔ (تفہیم القرآن، جلد ششم، سورہ الانشراح)

سورتوں کے درمیان ربط ومناسبت

مولانا مودودیؒ مختلف سورتوں کے درمیان مناسبت اور ربط بھی بیان کرتے ہیں۔ مثلاً سورۂ علق، سورۂ قدر اور سورۂ البینہ کو ایک ساتھ رکھنے کی حکمت، ان سورتوں کے درمیان ربط و مناسبت اور ان کی مخصوص ترتیب کے بارے میں فرماتے ہیں: ''قرآن کی ترتیب میں اس کو (یعنی سورۂ البینہ کو) سورۂ علق اور سورۂ قدر کے بعد رکھنا بہت معنی خیز ہے۔ سورۂ علق میں پہلی وحی درج کی گئی ہے۔ سورۂ قدر میں بتایا گیا ہے کہ وہ کب نازل ہوئی ہے؟ اور اس سورہ میں بتایا گیا ہے کہ اس کتاب کے ساتھ ایک رسول بھیجنا کیوں ضروری تھا؟ (تفہیم القرآن، جلد ششم، سورۂ البینۃ)

اسی طرح سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران کے درمیان ربط، پھر سورۂ بقرہ اور سورہ نساء کے درمیان ربط، پھر سورۂ آل عمران، سورۂ نساء اور سورۂ مائدہ کے مابین ربط کی وضاحت کی ہے۔

سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران دونوں میں خطاب یہود و نصاریٰ اور اہل ایمان سے ہے، یہود و نصاریٰ کو جن باتوں کی تبلیغ سورۂ بقرہ میں کی گئی تھی مزید تبلیغ اسی انداز سے سورۂ آل عمران کی گئی ہے، اور سورۂ بقرہ میں اہل ایمان کو جن باتوں سے متنبہ کیا گیا تھا اسی سلسلے کی مزید ہدایات سورۂ آل عمران میں دی گئی ہیں۔ اس کی تفصیل مولانا مودودیؒ یوں بیان کرتے ہیں:

''سورہ (آل عمران) کا خطاب خصوصیت کے ساتھ دو گروہوں کی طرف ہے: ایک اہل کتاب (یہود و نصاریٰ)، دوسرے وہ لوگ جو محمد ﷺ پر ایمان لائے تھے۔ پہلے گروہ کو اسی طرز پر مزید تبلیغ کی گئی جس کا سلسلہ سورۂ بقرہ میں شروع کیا گیا تھا۔ دوسرے گروہ کو، جواب بہترین امت ہونے کی حیثیت سے حق کا علمبردار اور دنیا کی اصلاح کا ذمہ دار بنایا جا چکا ہے، اسی سلسلے میں مزید ہدایات دی گئی ہیں، جو سورۂ بقرہ میں شروع ہوا تھا''۔ (تفہیم القرآن، جلد ا، سورۂ آل عمران)

اسی طرح سورۂ بقرہ کو سورۂ نساء سے یوں مربوط کرتے ہیں: ''اسلامی سوسائٹی کی تنظیم کے لیے سورۂ بقرہ میں جو ہدایات دی گئی تھیں، اب یہ سوسائٹی ان سے زائد ہدایات کی طالب تھی، اس لیے سورۂ نساء کے ان خطبوں میں زیادہ تفصیل کے ساتھ بتایا گیا کہ مسلمان اپنی

اجتماعی زندگی کو اسلام کے طریق پر کس طرح درست کریں؟ (تفہیم القرآن، جلد ا، سورۂ نساء)

سورۂ آل عمران اور سورۂ نساء کا ربط سورہ المائدہ سے یوں قائم کرتے ہیں: ''سورۂ آل عمران اور سورۂ نساء کے زمانۂ نزول سے اس سورہ (مائدہ) کے نزول تک پہنچتے پہنچتے حالات میں بڑا تغیر واقع ہو چکا تھا... مدینہ کے چاروں طرف تمام مخالف قبائل کا زور ٹوٹ گیا، مدینہ پر جو یہود خطرہ ہر وقت منڈلاتا رہتا تھا اس کا ہمیشہ کے لیے استیصال ہو گیا اور سب مدینہ کی حکومت کے باج گزار بن گئے۔ اسلام کو دبانے کے لیے قریش نے آخری کوشش غزوۂ خندق کے موقع پر کی اور اس میں وہ سخت ناکام ہوئے۔ اس کے بعد اہل عرب کو اس امر میں کچھ شک نہ رہا کہ اسلام کی تحریک اب کسی کے مٹائے نہیں مٹ سکتی۔ اب اسلام محض ایک عقیدہ و مسلک ہی نہ تھا، جس کی حکم رانی صرف دلوں اور دماغوں تک محدود ہو، بلکہ وہ ایک ریاست بھی تھا جس کی حکم رانی عملاً اپنے حدود میں رہنے والے تمام لوگوں کی زندگی پر محیط تھی۔ اب مسلمان اس طاقت کے مالک ہو چکے تھے کہ جس مسلک پر وہ ایمان لائے تھے، بے روک ٹوک اس کے مطابق زندگی بسر کر سکیں اور اس کے سوا کسی دوسرے عقیدہ و مسلک یا قانون کو اپنے دائرہ حیات میں دخل انداز نہ ہونے دیں۔ پھر ان چند برسوں میں اسلامی اصول اور نقطۂ نظر کے مطابق مسلمانوں کی ایک اپنی مستقل تہذیب بن چکی تھی جو زندگی کی تمام تفصیلات میں دوسروں سے الگ اپنی ایک امتیازی شان رکھتی تھی ... یہ حالات تھے جب سورۂ مائدہ نازل ہوئی۔ یہ سورہ تین بڑے بڑے مضامین پر مشتمل ہے۔ (۱) مسلمانوں کی مذہبی، تمدنی اور سیاسی زندگی کے متعلق مزید احکام و ہدایات، (۲) مسلمانوں کو نصیحت (۳) یہودیوں اور عیسائیوں کو نصیحت۔ (تفہیم القرآن، جلد اول، سورہ المائدہ)

سورۂ زلزال سے سورۂ الہمزۃ تک چھ سورتیں ہیں۔ ان کے درمیان باہم کیا ربط ہے، اس کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا مودودیؒ فرماتے ہیں: ''اس سورۃ (الہمزہ) کو اگر ان سورتوں کے تسلسل میں رکھ کر دیکھا جائے جو سورۂ زلزال سے یہاں تک چلی آ رہی ہیں تو آدمی بڑی اچھی طرح یہ سمجھ سکتا ہے کہ مکہ معظّمہ کے ابتدائی دور میں کس طریقہ سے اسلام کے عقائد اور اس کی اخلاقی تعلیمات کو لوگوں کے ذہن نشین کیا گیا تھا۔ سورۂ زلزال میں بتایا گیا کہ آخرت میں انسان کا پورا نامۂ اعمال اس کے سامنے رکھ دیا جائے گا اور کوئی ذرہ برابر نیکی یا بدی

بھی ایسی نہ ہوگی جو اس نے دنیا میں کی ہو اور وہ وہاں اس کے سامنے نہ آ جائے۔ سورۂ عادیات میں اس لوٹ مار، کشت وخون اور غارت گری کی طرف اشارہ کیا گیا جو عرب میں ہر طرف برپا تھی، پھر یہ احساس دلانے کے بعد کہ خدا کی دی ہوئی طاقتوں کا یہ استعمال اس کی بہت بڑی ناشکری ہے، لوگوں کو یہ بتایا گیا کہ معاملہ اسی دنیا میں ختم نہیں ہو جائے گا، بلکہ موت کے بعد دوسری زندگی میں تمہارے افعال ہی کی نہیں، تمہاری نیتوں تک کی جانچ پڑتال کی جائے گی اور تمہارا رب خوب جانتا ہے کہ کون آدمی کس سلوک کا مستحق ہے۔ سورۂ قارعہ میں قیامت کا نقشہ پیش کرنے کے بعد لوگوں کو خبردار کیا گیا کہ آخرت میں انسان کے اچھے یا برے انجام کا انحصار اس پر ہوگا کہ اس کی نیکیوں کا پلڑا بھاری ہے یا ہلکا۔ سورۂ تکاثر میں اس مادہ پرستانہ ذہنیت پر گرفت کی گئی ہے جس کی وجہ سے لوگ مرتے دم تک بس دنیا کے فائدے اور لذتیں اور عیش وآرام اور جاہ ومنزلت زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے اور ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں، پھر اس غفلت کے برے انجام سے آگاہ کر کے لوگوں کو بتایا گیا کہ یہ دنیا کوئی خوان یغما نہیں کہ اس پر جتنا اور جس طرح چاہو ہاتھ مارو، بلکہ ایک ایک نعمت، جو یہاں تمہیں مل رہی ہے، اس کے لیے تمہیں اپنے رب کو جواب دینا ہوگا کہ اسے تم نے کیسے حاصل کیا اور حاصل کر کے اس کو کس طرح استعمال کیا۔ سورۂ عصر میں بالکل دوٹوک طریقے سے بتا دیا گیا کہ نوع انسانی کا ایک ایک فرد، ایک ایک گروہ، ایک ایک قوم، حتیٰ کہ پوری دنیائے انسانیت خسارے میں ہے اگر اس کے افراد میں ایمان وعمل صالح نہ ہو اور اس کے معاشرے میں حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کا رواج عام نہ ہو۔ اس کے معاً بعد سورۂ ہمزہ آتی ہے، جس میں جاہلیت کی سرداری کا ایک نمونہ پیش کر کے لوگوں کے سامنے گویا یہ سوال رکھ دیا گیا کہ یہ کردار آخر خسارے کا موجب کیوں نہ ہو؟ (تفہیم القرآن، جلد ششم، سورۃ الھمزہ)

ان شواہد سے بہ خوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ مولانا مودودیؒ سورتوں کے درمیان ہم آہنگی اور ربط ونظم کی وضاحت کرتے ہیں اور تشریح وتفسیر کے دوران بہ ظاہر بے ربط مضمون آجانے پر اس طرح وضاحت کرتے ہیں کہ پورا مضمون مربوط نظر آنے لگتا ہے۔ مثلاً سورۂ آل عمران آیت نمبر ۱۲۹ میں جنگِ احد پر تبصرہ ہو رہا تھا، اچانک یہ حکم دیا گیا کہ ''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، یہ بڑھتا اور چڑھتا سود کھانا چھوڑ دو اور اللہ سے ڈرو'' (آل عمران، آیت ۱۳۰)

اس موقع پر مولانا یوں تشریح کرتے ہیں: ''احد کی شکست کا بڑا سبب یہ تھا کہ مسلمان عین کامیابی کے موقع پر مال کی طمع سے مغلوب ہو گئے اور اپنے کام کو تکمیل تک پہنچانے کے بجائے غنیمت لوٹنے میں لگ گئے۔ اس لیے حکیم مطلق نے اس حالت کی اصلاح کے لیے زر پرستی کے سرچشمے پر بند باندھنا ضروری سمجھا اور حکم دیا کہ سودخواری سے باز آؤ، جس میں آدمی رات دن اپنے نفع کے بڑھنے اور چڑھنے کا حساب لگاتا رہتا ہے اور جس کی وجہ سے آدمی کے اندر روپے کی حرص بے حد بڑھتی چلی جاتی ہے'' (تفہیم القرآن، جلد اول، سورہ آل عمران، حاشیہ ۹۸)

سیاق وسباق کی رعایت

مولانا مودودیؒ تفسیر بیان کرتے وقت سیاق وسباق کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ وہ سلسلۂ کلام کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ سیاق وسباق سے ہٹ کر معنی اخذ کرنے سے لاطائل تاویلوں کا دروازہ کھلتا ہے اور آیت کے معنی ومفہوم کو متعین کرنے میں غلطی سرزد ہوتی ہے۔

سورۂ النحل میں ہے:

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلَى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ فَمَا الَّذِينَ فُضِّلُوا بِرَادِّي رِزْقِهِمْ عَلَى مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيهِ سَوَاءٌ أَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُونَ (آیت:۷۱)

(اور دیکھو، اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق میں فضیلت عطا کی ہے، پھر جن لوگوں کو یہ فضیلت دی گئی ہے وہ ایسے نہیں ہیں کہ اپنا رزق اپنے غلاموں کی طرف پھیر دیا کرتے ہوں، تاکہ دونوں اس رزق میں برابر کے حصہ دار بن جائیں۔ تو کیا اللہ ہی کا احسان ماننے سے ان لوگوں کو انکار ہے)۔

اس آیت کی تشریح میں مولانا فرماتے ہیں: ''زمانۂ حال میں اس آیت سے جو عجیب وغریب معنی نکالے گئے ہیں وہ اس امر کی بدترین مثال ہیں کہ قرآن کی آیات کو ان کے سیاق وسباق سے الگ کر کے ایک ایک آیت کے الگ معنی لینے سے کیسی کیسی لاطائل تاویلوں کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ لوگوں نے اس آیت کو اسلام کے فلسفۂ معیشت کی اصل اور قانونِ معیشت کی اہم دفعہ ٹھیرایا ہے۔ ان کے نزدیک آیت کا منشا یہ ہے کہ جن لوگوں کو اللہ نے رزق میں فضیلت عطا کی ہو انہیں اپنا رزق اپنے نوکروں اور غلاموں کی طرف ضرور لوٹا دینا چاہیے،

اگر نہ لوٹائیں گے تو اللہ کی نعمت کے منکر قرار پائیں گے، حالانکہ اس سلسلۂ کلام میں قانونِ معیشت کے بیان کا سرے سے کوئی موقع ہی نہیں ہے۔ اوپر سے تمام تقریر شرک کے ابطال اور توحید کے اثبات میں ہوتی چلی آرہی ہے اور آگے بھی یہی مضمون چل رہا ہے۔ اس گفتگو کے بیچ میں یکا یک قانونِ معیشت کی ایک دفعہ بیان کر دینے کا آخر کون سا تُک ہے؟ آیت کو اس کے سیاق و سباق میں رکھ کر دیکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اس کے بالکل برعکس مضمون بیان ہو رہا ہے۔ یہاں استدلال یہ کیا گیا ہے کہ تم خود اپنے مال میں اپنے غلاموں اور نوکروں کو جب برابر کا درجہ نہیں دیتے—— حالانکہ یہ مال خدا کا دیا ہوا ہے—— تو آخر کس طرح یہ بات تم صحیح سمجھتے ہو کہ جو احسانات اللہ نے تم پر کیے ہیں ان کے شکریے میں اللہ کے ساتھ اس کے بے اختیار غلاموں کو بھی شریک کر لو اور اپنی جگہ یہ سمجھ بیٹھو کہ اختیارات اور حقوق میں اللہ کے یہ غلام بھی اس کے ساتھ برابر کے حصہ دار ہیں؟ ٹھیک یہی استدلال، اسی مضمون سے سورۂ روم، آیت نمبر ۲۸ میں کیا گیا ہے۔ (تفہیم القرآن، جلد دوم، سورہ نحل، حاشیہ ۶۲)

قرآن کی ایسی تفسیر کی جائے جو اس کے مجموعی نظامِ فکر سے مطابقت رکھتی ہو

مولانا مودودیؒ فرماتے ہیں کہ اصولاً قرآن کی ہر آیت کی وہی تفسیر صحیح ہو سکتی ہے جو اس کے دوسرے بیانات اور اس کے مجموعی نظام فکر سے مطابقت رکھتی ہو۔ انھوں نے اس اصول کا بہت باریک بینی سے جائزہ لیا ہے، اس کے بارے میں اٹھنے والے سوالات کا جواب دیا ہے اور اس کے نتائج پر گفتگو کی ہے، پھر تفسیر کے سلسلہ میں کہاں بنیادی طور پر غلطی سرزد ہوئی ہے اس کی نشان دہی کی ہے۔ سورۂ انبیاء میں ہے:

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِن بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ. إِنَّ فِي هَٰذَا لَبَلَاغًا لِّقَوْمٍ عَابِدِينَ۔ (آیات: ۱۰۵-۱۰۶)

''اور زبور میں ہم نصیحت کے بعد یہ لکھ چکے ہیں کہ زمین کے وارث ہمارے نیک بندے ہوں گے، اس میں ایک بڑی خبر ہے عبادت گزار لوگوں کے لیے''۔

ان آیات کی تشریح میں مولانا فرماتے ہیں:

''اس آیت کا مطلب سمجھنے میں بعض لوگوں نے سخت ٹھوکر کھائی ہے اور اس سے

ایک ایسا مطلب نکال لیا ہے جو پورے قرآن کی تردید اور پورے نظامِ دین کی بیخ کنی کر دیتا ہے۔ وہ آیت کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ دنیا کی موجودہ زندگی میں زمین کی وراثت (یعنی حکومت وفرماں روائی اور زمین کے وسائل پر تصرف) صرف صالحین کو ملا کرتی ہے اور انہی کو اللہ تعالیٰ اس نعمت سے نوازتا ہے۔ پھر اس قاعدۂ کلیہ سے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ صالح اور غیر صالح کے فرق و امتیاز کا معیار یہی وراثتِ زمین ہے۔ جس کو یہ وراثت ملے وہ صالح ہے اور جس کو نہ ملے وہ غیر صالح۔ اس کے بعد وہ آگے بڑھ کر ان قوموں پر نگاہ ڈالتے ہیں جو دنیا میں پہلے وارثِ زمین رہی ہیں اور آج اس وراثت کی مالک بنی ہوئی ہیں۔ یہاں وہ دیکھتے ہیں کہ کافر، مشرک، دہریے، فاسق، فاجر، سب یہ وراثت پہلے بھی پاتے رہے ہیں اور آج بھی پا رہے ہیں۔ جن قوموں میں وہ تمام اوصاف پائے گئے ہیں اور آج پائے جاتے ہیں جنہیں قرآن صاف الفاظ میں کفر، فجور، معصیت اور بدی سے تعبیر کرتا ہے، وہ اس وراثت سے محروم نہیں ہوئیں، بلکہ نوازی گئیں اور آج بھی نوازی جاری ہیں۔ فرعون و نمرود سے لے کر اس زمانے کے کمیونسٹ فرماں رواؤں تک کتنے ہی ہیں جو کھلم کھلا خدا کے منکر، مخالف، بلکہ مدمقابل بنے ہیں اور پھر بھی وارثِ زمیں ہوئے ہیں۔ اس منظر کو دیکھ کر وہ یہ رائے قائم کرتے ہیں کہ قرآن کا بیان کردہ قاعدۂ کلیہ تو غلط نہیں ہوسکتا، اب لامحالہ غلطی جو کچھ ہے وہ 'صالح' کے اس مفہوم میں ہے جو اب تک مسلمان سمجھتے رہے ہیں۔ چنانچہ وہ صلاح کا ایک نیا تصور تلاش کرتے ہیں، جس کے مطابق زمین کے وارث ہونے والے سب لوگ یکساں صالح قرار پا سکیں، قطع نظر اس سے کہ وہ ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ ہوں یا چنگیز اور ہلاکو۔ اس نئے تصور کی تلاش میں ڈارون کا نظریۂ ارتقاء ان کی رہنمائی کرتا ہے اور وہ قرآن کے تصورِ صلاح کو ڈارونی تصورِ صلاحیت (Fitness) سے لے جا کر ملا دیتے ہیں۔

اس نئی تفسیر کی رو سے آیتِ زیرِ بحث کے معنی یہ قرار پاتے ہیں کہ جو شخص اور گروہ بھی مما لک کو فتح کرے اور ان پر زور قوت کے ساتھ اپنی حکومت چلانے اور زمین کے وسائل کو کامیابی کے ساتھ استعمال کرنے کی قابلیت رکھتا ہو وہی 'خدا کا صالح بندہ' ہے اور اس کا یہ فعل تمام 'عابد' انسانوں کے لیے پیغام ہے کہ 'عبادت' اس چیز کا نام ہے جو یہ شخص اور گروہ کر رہا ہے۔ اگر یہ عبادت تم نہیں کرتے اور نتیجہ میں وراثتِ زمین سے محروم رہ جاتے ہو تو نہ

تمہارا شمار صالحین میں ہوسکتا ہے اور نہ تم کو خدا کا عبادت گزار بندہ کہا جا سکتا ہے۔

یہ معنی اختیار کرنے کے بعد ان حضرات کے سامنے یہ سوال آیا کہ اگر 'صلاح' اور 'عبادت' کا تصور یہ ہے تو پھر وہ ایمان (ایمان باللہ، ایمان بالیوم الآخر، ایمان بالرسل اور ایمان بالکتب) کیا ہے جس کے بغیر، خود اس قرآن کی رؤ سے خدا کے ہاں کوئی عمل صالح مقبول نہیں؟ اور پھر قرآن کی اس دعوت کے کیا معنی کہ اس نظام اخلاق اور قانون زندگی کی پیروی کرو جو خدا نے اپنے رسول کے ذریعہ بھیجا ہے؟ اور پھر قرآن کا بار بار یہ کہنا کیا معنی رکھتا ہے کہ جو رسول کو نہ مانے اور خدا کے نازل کردہ احکام کا اتباع نہ کرے وہ کافر، فاسق، عذاب کا مستحق اور مغضوب بارگاہ خداوندی ہے؟ یہ سوالات ایسے تھے کہ اگر یہ لوگ ان پر ایمان کے ساتھ غور کرتے تو محسوس کر لیتے کہ ان سے اس آیت کا مطلب سمجھنے اور صلاح کا ایک نیا تصور قائم کرنے میں غلطی ہوئی ہے۔لیکن انہوں نے اپنی غلطی محسوس کرنے کے بجائے پوری جسارت کے ساتھ ایمان، اسلام، توحید، آخرت، رسالت، ہر چیز کے معنی بدل ڈالے، تاکہ وہ سب ان کی اس ایک آیت کی تفسیر کے مطابق ہو جائیں اور اس ایک چیز کو کو ٹھیک بٹھانے کی خاطر انہوں نے قرآن کے ساری تعلیمات کو الٹ پلٹ کر ڈالا۔اس پر لطیفہ یہ ہے کہ جو لوگ ان کی اس مرمتِ دین سے اختلاف کرتے ہیں، ان کو یہ الٹا الزام دیتے ہیں کہ خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں۔ یہ دراصل مادی ترقی کی خواہش کا ہیضہ ہے جو بعض لوگوں کو اس بری طرح سے لاحق ہوگیا ہے کہ وہ قرآن کی معنوی تحریف کرنے میں بھی تامل نہیں کرتے۔

ان کی اس تفسیر میں پہلی بنیادی غلطی یہ ہے کہ یہ لوگ ایک آیت کی ایسی تفسیر کرتے ہیں جو قرآن کی مجموعی تعلیمات کے خلاف پڑتی ہے، حالاں کہ اصولاً قرآن کی ہر آیت کی وہی تفسیر صحیح ہوسکتی ہے جو اس کے دوسرے بیانات اور اس کے مجموعی نظام فکر سے مطابقت رکھتی ہو۔کوئی شخص، جس نے کبھی قرآن کو ایک دفعہ بھی سمجھ کر پڑھنے کی کوشش کی ہے، اس بات سے ناواقف نہیں رہ سکتا کہ قرآن جس چیز کو نیکی اور تقوی اور بھلائی کہتا ہے وہ 'مادی ترقی اور حکم رانی کی صلاحیت' کی ہم معنی نہیں ہے اور 'صالح' کو اگر 'صاحبِ صلاحیت' کے معنی میں لے لیا جائے تو یہ ایک آیت پورے قرآن سے ٹکرا جاتی ہے۔

دوسرا سبب، جو اس غلطی کا موجب ہوا ہے، یہ ہے کہ یہ لوگ ایک آیت کو اس کے

سیاق و سباق سے الگ کر کے بے تکلف جو معنی چاہتے ہیں اس کے الفاظ سے نکال لیتے ہیں، حالاں کہ ہر آیت کے صحیح معنی صرف وہی ہو سکتے ہیں جو سیاق و سباق سے مطابقت رکھتے ہوں۔ اگر یہ غلطی نہ کی جاتی تو آسانی کے ساتھ دیکھا جا سکتا تھا کہ اوپر سے جو مضمون مسلسل چلا آ رہا ہے وہ عالم آخرت میں مومنین صالحین اور کفار مشرکین کے انجام سے بحث کرتا ہے۔ اس مضمون میں یکا یک اس مضمون کے بیان کرنے کا آخر کون سا موقع تھا کہ دنیا میں وراثتِ زمین کا انتظام کس قاعدے پر ہو رہا ہے۔

تفسیر کے صحیح اصولوں کو ملحوظ رکھ کر دیکھا جائے تو آیت کا مطلب صاف ہے کہ دوسری تخلیق میں، جس کا ذکر اس سے پہلے کی آیت میں ہوا ہے، زمین کے وارث صرف صالح لوگ ہوں گے اور اس ابدی زندگی کے نظام میں موجودہ عارضی نظام زندگی سی کیفیت برقرار نہ رہے گی کہ زمین پر فاسقوں اور ظالموں کو بھی تسلط حاصل ہو جاتا ہے۔ یہ مضمون سورۂ مومنون آیات ۴-۱۱ میں بھی ارشاد ہوا ہے اور اس سے زیادہ صریح الفاظ میں سورۂ زمر کے خاتمہ پر بیان کیا گیا ہے، جہاں اللہ تعالیٰ قیامت اور نفخِ صور اول و ثانی کا ذکر کرنے کے بعد اپنی عدالت کا ذکر فرماتا ہے، پھر کفر کا انجام بیان کر کے نیک لوگوں کا انجام یہ بتاتا ہے کہ ''وَسِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ إِلَى الْجَنَّةِ زُمَراً حَتَّى إِذَا جَآؤُوْهَا وَفُتِحَتْ أَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلَامٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوهَا خٰلِدِيْنَ. وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ صَدَقَنَا وَعْدَهُ وَأَوْرَثَنَا الْأَرْضَ نَتَبَوَّأُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَاء فَنِعْمَ أَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ'' آیات: ۷۳-۷۴ (اور جن لوگوں نے اپنے رب کے خوف سے تقوی اختیار کیا تھا وہ جنت کی طرف گروہ در گروہ لے جائے جائیں گے، یہاں تک کہ جب وہ وہاں پہنچ جائیں گے تو ان کے لیے جنت کے دروازے کھول دیے جائیں گے اور اس کے منتظم ان سے کہیں گے: سلام ہو تم کو، تم بہت اچھے رہے، آؤ، اب اس میں ہمیشہ رہنے کے لیے داخل ہو جاؤ۔ اور وہ کہیں گے کہ حمد ہے اس خدا کی جس نے ہم سے اپنا وعدہ پورا کیا اور ہم کو زمین کا وارث کر دیا، اب ہم جنت میں جہاں چاہیں اپنی جگہ بنا سکتے ہیں پس بہترین اجر ہے عمل کرنے والوں کے لیے)۔ دیکھیے، یہ دونوں آیتیں ایک ہی مضمون بیان کر رہی ہیں، اور دونوں جگہ وراثتِ زمین کا تعلق عالم آخرت سے ہے نہ کہ اس دنیا سے''۔ اس کے بعد مولانا نے حضرت داؤد علیہ السلام کے مزمور

سے حوالہ پیش کیا ہے کہ ''صادق زمین کے وارث ہوں گے اور اس میں ہمیشہ بسے رہیں گے''۔ مزمور آیات ۹-۱۰-۱۱-۱۸-۲۹ (تفہیم القرآن، جلد سوم، سورۂ انبیاء، حاشیہ ۹۹)

تفسیر میں شانِ کلام سے استدلال

مولانا مودودیؒ نے تفسیر قرآن کا ایک اہم نکتہ یہ بیان کیا ہے کہ شانِ کلام کو ملحوظ رکھنا چاہیے کہ اس سے معنیٰ اور مفہوم متعین کرنے میں مدد ملتی ہے۔ اگر وہ پیش نظر نہ ہو تو تفسیر میں غلطی کا احتمال رہتا ہے۔ مثال کے طور پر سورۂ یوسف کی آیت ہے:

ذٰلِکَ لِیَعْلَمَ اَنِّیْ لَمْ اَخُنْہُ بِالْغَیْبِ وَاَنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِیْ کَیْدَ الْخَآئِنِیْنَ (آیت:۵۲)

''(اس نے کہا) اس سے میری غرض یہ تھی کہ (عزیز) یہ جان لے کہ میں نے درپردہ اس کی خیانت نہیں کی تھی، اور یہ کہ جو خیانت کرتے ہیں ان کی چالوں کو اللہ کامیابی کی راہ پر نہیں لگاتا''۔

اس آیت کی تشریح میں مولانا فرماتے ہیں:

''یہ بات غالباً حضرت یوسفؑ نے اس وقت کہی ہوگی جب قید خانہ میں آپ کو تحقیقات کے نتیجے کی خبر دی گئی ہوگی۔ بعض مفسرین، جن میں ابن تیمیہؒ اور ابن کثیرؒ جیسے فضلاء بھی شامل ہیں، اس فقرے کو حضرت یوسف کا نہیں، بلکہ عزیز کی بیوی کے قول کا ایک حصہ قرار دیتے ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ یہ فقرہ امرأۃ العزیز کے قول سے متصل آیا ہے اور بیچ میں کوئی ایسا لفظ نہیں آیا ہے جس سے یہ سمجھا جائے کہ 'انہ لمن الصادقین' پر امرأۃ العزیز کی بات ختم ہوگئی اور بعد کا کلام حضرت یوسف کی زبان سے ادا ہوا۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر دو آدمیوں کے قول ایک دوسرے سے متصل واقع ہوں اور اس امر کی صراحت نہ ہو کہ یہ قول فلاں کا ہے اور یہ فلاں کا، تو اس صورت میں لازماً کوئی قرینہ ایسا ہونا چاہیے جس سے دونوں کے کلام میں فرق کیا جا سکے، اور یہاں ایسا کوئی قرینہ موجود نہیں ہے۔ اس لیے یہی ماننا پڑے گا کہ 'الآن حصحص' سے لے کر 'ان ربی غفور رحیم' تک پورا کلام امرأۃ العزیز کا ہی ہے، لیکن مجھے تعجب ہے کہ ابن تیمیہؒ جیسے دقیقہ رس آدمی تک کی نگاہ سے یہ بات کیسے چوک گئی کہ شان کلام بجائے خود ایک بہت بڑا قرینہ ہے جس کے ہوتے کسی اور قرینہ کی ضرورت نہیں رہتی۔ پہلا فقرہ تو بلا شبہ امرأۃ العزیز کے منہ پر پھبتا ہے، مگر کیا دوسرا فقرہ بھی اس کی حیثیت کے مطابق نظر آتا ہے؟ یہاں تو شان کلام صاف کہہ رہی ہے کہ اس کے قائل حضرت یوسفؑ ہیں،

نہ کہ عزیز مصر کی بیوی۔ اس کلام میں جو نیک نفسی، جو عالی ظرفی، جو فروتنی اور جو خدا ترسی بول رہی ہے وہ خود گواہ ہے کہ یہ فقرہ اس زبان سے نکلا ہوا نہیں ہوسکتا جس سے هَيْتَ لَكَ نکلا تھا، جس سے 'مَا جَزَاءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْءً' نکلا تھا، اور جس سے بھری محفل کے سامنے یہ تک نکل سکتا تھا کہ 'لَئِنْ لَّمْ يَفْعَلْ مَا آمُرُهُ لَيُسْجَنَنَّ'۔ ایسا پاکیزہ فقرہ تو وہی زبان بول سکتی تھی جو اس سے پہلے 'مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهُ رَبِّیْ اَحْسَنَ مَثْوَایَ' کہہ چکی تھی، جو 'رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا يَدْعُوْنَنِی اِلَيْهِ' کہہ چکی تھی، جو 'اِلَّا تَصْرِفْ عَنِّی كَيْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَيْهِنَّ' کہہ چکی تھی۔ ایسے پاکیزہ کلام کو یوسف صدیق کے بجائے امرأۃ العزیز کا کلام ماننا اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک کوئی قرینہ اس امر پر دلالت نہ کرے کہ اس مرحلے پر پہنچ کر اسے توبہ اور ایمان اور اصلاحِ نفس کی توفیق نصیب ہوگئی تھی، اور افسوس ہے کہ ایسا کوئی قرینہ موجود نہیں ہے'۔ (تفہیم القرآن، جلد دوم، سورۂ یوسف، حاشیہ ۴۶)

قرآن کی غلط تفسیر کرنے والی روایات پر تنقید

مولانا مودودیؒ نے اپنی تفسیر کے دوران جگہ جگہ احادیث سے استشہاد کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن کو سمجھنے میں ہم حدیث سے بے نیاز نہیں ہوسکتے (رسائل و مسائل، حصہ سوم) لیکن کوئی ایسی روایت، جس سے پورے دین کی بنیاد ہی خطرے میں پڑ جائے، ان کے نزدیک قابل قبول نہیں ہے۔ وہ قرآن کی غلط تفسیر کرنے والی روایات پر جرح کرتے ہیں اور ان کے رد میں عقلی و نقلی دونوں طرح کی دلیلیں دیتے ہیں، محدثین و مفسرین کی آراء پیش کرتے ہیں اور درایت حدیث پر اٹھنے والے تمام سولات کے جوابات بھی دیتے ہیں، جیسا کہ سورۂ حج کے حاشیہ ۱۰۱ اور سورۂ انبیاء کے حاشیہ ۶۰ میں اس کی تفصیل موجود ہے (مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے رسائل و مسائل، حصہ دوم، ص ۳۲ تا ۳۴)

مکی سورتوں کی چار ادوار میں تقسیم

مولانا مودودیؒ نے مکی سورتوں کو چار ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ وہ ان ادوار کا ذکر ہر مکی سورہ کے دیباچہ میں کرتے ہیں اور اس کے زمانۂ نزول کو متعین کرتے ہوئے تفصیل سے ان حالات اور پس منظر کو پیش کرتے ہیں جس سے مکی زندگی کے مختلف ادوار پر روشنی پڑتی ہے۔ ان

ادوار کے مطالعہ سے دعوت اسلامی کو پیش کرنے کے طریقۂ کار اور اس کے منصوبوں کے بارے میں آگہی ہوتی ہے۔اس تقسیم سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک قرآن مجید کی تفسیر کا ایک اہم پہلو دعوت الی اللہ کی تاریخ کو اجاگر کرنا ہے۔ دعوت کے ان چاروں مراحل میں خفیہ و اعلانیہ دعوت، دعوت اسلامی کی کشمکش، صبر و آزمائش، ہجرتِ حبشہ اور سفرِ طائف کی پوری تاریخ آجاتی ہے۔ دعوتِ اسلامی کے یہ مراحل قاری کے لیے مشعل راہ ہیں۔

مولانا سورۂ انعام کے دیباچہ میں فرماتے ہیں: ''مکی سورتوں کے معاملہ میں ہم کو تاریخی شہادتوں کے بجائے زیادہ تر ان اندرونی شہادتوں پر اعتماد کرنا پڑتا ہے جو مختلف سورتوں کے موضوع، مضمون اور انداز بیان میں، اور اپنے پس منظر کی طرف ان کے جلی یا خفی اشارات میں پائی جاتی ہیں۔اور ظاہر ہے کہ اس نوعیت کی شہادتوں سے مدد لے کر ایک ایک سورۃ اور ایک ایک آیت کے متعلق یہ تعین نہیں کیا جاسکتا کہ فلاں تاریخ کو، یا فلاں سنہ میں فلاں موقع پر نازل ہوئی ہے۔زیادہ صحت کے ساتھ جو کچھ کہا جاسکتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک طرف ہم مکی سورتوں کی اندرونی شہادتوں کو، اور دوسری طرف نبی ﷺ کی مکی زندگی کی تاریخ کو آمنے سامنے رکھیں اور پھر دونوں کا تقابل کرتے ہوئے یہ رائے قائم کریں کہ کون سی سورۃ کس دور سے تعلق رکھتی ہے۔اس طرز تحقیق کو ذہن میں رکھ کر جب ہم نبی ﷺ کی زندگی پر نگاہ ڈالتے ہیں تو وہ دعوت اسلامی کے نقطۂ نظر سے چار بڑے بڑے نمایاں ادوار پر منقسم نظر آتی ہے: پہلا دور آغازِ بعثت سے لے کر اعلانِ نبوت تک، تقریباً ۳ سال، دوسرا دور اعلان نبوت سے لے کر ظلم وستم اور فتنہ کے آغاز تک، تقریباً ۲ سال، تیسرا دور آغازِ فتنہ (۵ نبوی) سے لے کر ابوطالب اور حضرت خدیجہؓ کی وفات تک، تقریباً پانچ چھ سال، چوتھا دور ۱۰ نبوی سے لے کر ۱۳ نبوی تک تقریباً ۳ سال۔ (تفہیم القرآن، جلد اول، سورۂ انعام)

مولانا مودودیؒ نے تمام مکی سورتوں کی تفسیر میں دعوتی مراحل کو پیش نظر رکھا ہے اور ہر مکی سورت کے ذیل میں یہ صراحت کردی ہے کہ اس کا تعلق کس مرحلہ سے ہے۔

یہ مولانا مودودیؒ کی تفسیر تفہیم القرآن کا ایک مختصر مطالعہ ہے، جس کے ذریعے اس کے تفسیری منہج کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔اس موضوع پر مزید تفصیل اور تحقیق کے ساتھ کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ☆☆☆

تعارف وتبصرہ

فتح الخبیر فی ما لابدّ من حفظه فی علم التفسیر (عربی) شاہ ولی اللہ دہلویؒ
تحقیق: محمد حسان اختر ندوی

ناشر: مؤسسۃ الثقافۃ واللغۃ لکھنؤ، ملنے کا پتہ: مکتبہ الجامعۃ الاسلامیۃ، مظفر پور، اعظم گڑھ، صفحات: ۱۶۴

علوم قرآنی کے میدان میں شاہ ولی اللہ دہلوی (م ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء) کی بڑی قابل قدر خدمات ہیں۔ انھوں نے قرآن فہمی کی ایک طرح سے تحریک چلائی، فتح الرحمٰن کے نام سے قرآن کریم کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا، اس کے علاوہ متعدد رسالے تحریر فرمائے، جن میں الفوز الکبیر فی اصول التفسیر اور فتح الخبیر فی مالابدمن حفظہ فی علم التفسیر کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ مؤخر الذکر رسالہ الفوز الکبیر کے پانچویں باب کی حیثیت سے اس کے ساتھ مسلسل طبع ہوتا رہا ہے اور مستقل رسالہ کی شکل میں بھی اس کی کئی اشاعتیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ اس میں شاہ صاحب نے مصحف کی ترتیب پر حضرت ابن عباسؓ سے مختلف سندوں سے مروی غریب القرآن (قرآن کے مشکل الفاظ) کی شرح جمع کردی ہے۔ (یہ تشریحات علامہ جلال الدین سیوطی (م ۹۱۱ھ/ ۱۵۰۵ء) نے اپنی کتاب الاتقان فی علوم القرآن میں الگ الگ سندوں سے بیان کی ہیں۔) ساتھ ہی صحیح بخاری، جامع ترمذی اور مستدرک حاکم میں مروی اسباب نزول کی روایتوں کو بھی اس میں شامل کردیا ہے۔ زیر نظر کتاب اسی رسالے کا محقق ایڈیشن ہے۔

کتاب کی ابتداء میں مختصر مقدمۂ محقق کے علاوہ شاہ صاحب کے مختصر حالات زندگی بیان ہوئے ہیں۔ الفاظ قرآنی کے ضمن میں ان آیات کے نمبر درج کردیے گئے ہیں، جن میں وہ الفاظ آئے ہیں۔ اس کے علاوہ احادیث وآثار کی تخریج بھی کردی گئی ہے۔ سنن اربعہ اور مستدرک حاکم میں بعض ضعیف روایتیں بھی ہیں۔ شاہ صاحب نے ان سے اسباب نزول کی جو روایتیں لی ہیں، ان میں بھی کچھ ضعیف ہیں۔ اگر فاضل محقق تخریج کے ساتھ ان کے ضعف کی طرف بھی اشارہ کردیتے تو کتاب کی افادیت میں اضافہ ہوتا۔

بہرحال فاضل محقق، جو جامعہ اسلامیہ مظفر پور اعظم گڑھ میں استاذ ہیں، اس خدمت پر علوم قرآنی کے شائقین کی جانب سے شکریے کے مستحق ہیں۔ اللہ تعالی انھیں جزائے خیر دے اور ان سے مزید علمی کام لے۔ (محمد رضی الاسلام ندوی)

مختصر تاریخ ثقافت اسلامی مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی

ترجمہ وحواشی: ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

ناشر: علامہ ابوالحسن ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیر فاؤنڈیشن علی گڑھ، صفحات ۲۸۰، قیمت-/۱۸۰روپے

تاریخ کے مختلف ادوار میں مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کو عروج حاصل رہا ہے، جیسے بابلی، کلدانی، عبرانی، یونانی، ایرانی، رومی، مصری، ہندو، بدھ اور مجوسی وغیرہ۔ یہ تمام تہذیبیں وقت کے ساتھ دنیا سے تقریباً مٹ چکی ہیں۔ جب اسلام کا غلبہ ہوا تو اس نے بھی ایک تہذیب اور ثقافت برپا کی، جس کے اثرات آج بھی موجود ہیں اور ان اثرات کو مٹانا آسان نہیں ہے۔ مسلمانوں کو تعمیر وترقی اور علم سے بڑا شغف تھا۔ انھوں نے جس ذوق وشوق سے کتب خانوں کی ترتیب وآرائش اور حسن انتظام کیا، علوم کے مراکز قائم کیے، طلبہ کی سرپرستی کی اور علماء، ادباء، شعراء، فلاسفہ، متکلمین اور فن کاروں، مصوروں، کاری گروں، پیشہ وروں اور مختلف علوم و فنون کے ماہرین کے ساتھ جو حسن سلوک کیا اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ زیر تبصرہ کتاب میں انہی علوم وفنون میں مسلمانوں کے کارناموں کو انتہائی اختصار کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

کتاب میں مقدمہ اور تقریظ کے علاوہ چھ فصلیں ہیں۔ ہر فصل میں اسلامی ثقافت کے ایک پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ پہلی فصل میں ثقافت کی تعریف، دین وتہذیب کے درمیان فرق اور اسلامی ثقافت کی خصوصیات زیر بحث لائی گئی ہیں، دوسری فصل میں اسلامی ممالک کے حدودِ اربعہ اور اسلامی ثقافتی مراکز کی نشان دہی کی گئی ہے۔ تیسری فصل میں ہندوستان میں اسلامی حکومت اور یہاں کے اصحابِ فضل وکمال کا تذکرہ ہے، چوتھی فصل میں علمی تحریک کے تحت اسلامی ثقافت کے برگ وبار اور مختلف علوم وفنون کی توسیع کا ذکر ہے۔ پانچویں فصل میں اسلامی فنِ تعمیر کا تذکرہ کیا گیا ہے اور مسلمانوں کے ذریعے نئے شہروں کی آبادکاری اور ان کی خصوصیات مذکور ہیں۔ چھٹی فصل میں مساجد، مدارس، تعلیمی مراکز اور شفاخانوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس طرح یہ کتاب اسلامی ثقافت کی تاریخ کو جامعیت کے ساتھ پیش کرنے کی ایک عمدہ کوشش ہے۔

یہ کتاب دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے موقر استاد اور ناظم تعلیمات مولانا سید واضح رشید ندوی نے اصلاً عربی زبان میں تصنیف کی ہے۔ اس کا اردو ترجمہ علی گڑھ میں ندوہ کی شاخ

مدرسۃ العلوم الاسلامیۃ کے مہتمم ڈاکٹر طارق ایوبی ندوی نے کیا ہے۔ ترجمہ سلیس اور رواں ہے۔ فاضل مترجم نے ترجمہ کے ساتھ مفید تعلیقات اور حواشی کا اضافہ بھی کیا ہے۔ خاص طور سے ہندوستان کے اصحابِ فضل وکمال کے ذیل میں ان کا مختصر تعارف پیش کرکے کتاب کی قدر و قیمت میں اضافہ کیا ہے۔ اس کے لیے وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔

مجموعی طور پر کتاب لائق مطالعہ ہے، خصوصاً طلبۂ علوم وفنون کے لیے اس کا مطالعہ مفید تر ہے۔ (محمد جرجیس کریمی)

اردو ادب کا تہذیبی تناظر ڈاکٹر سید عبدالباری

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۳، ص ۳۲۴، قیمت -/۲۷۰ روپے

ڈاکٹر سید عبدالباری ادارۂ ادب اسلامی ہند کے سابق صدر، اس کے ترجمان 'پیش رفت' کے مدیر، سابق صدر شعبۂ اردو، اودھ یونی ورسٹی، فیض آباد اور متعدد ادبی اور اسلامی کتابوں کے مصنف ہیں۔ پیش رفت میں شائع ہونے والے ان کے فکرانگیز اداریے قاری کو معرفت وبصیرت کا سامان فراہم کرتے ہیں۔

زیرتبصرہ کتاب اصلاً وہ مقالہ ہے جو مصنف نے اپنے دورِ طالب علمی (۱۹۵۵ء) میں دہلی یونی ورسٹی کے زیراہتمام منعقدہ کل ہند بین جامعاتی تحریری مقابلے کے لیے لکھا تھا اور جس پر انھیں اوّل انعام کا مستحق قرار دیا گیا تھا، بعد میں یہ کتاب 'ہندوستانی تہذیب اور اردو' کے نام سے جامعہ اردو علی گڑھ کے اشاعتی ادارے سے شائع ہوئی اور برسوں وہاں کے ادیب کامل کے نصاب میں شامل رہی۔ اب نصف صدی کے بعد اسی مقالے یا کتاب کو نظرثانی کے بعد شائع کیا گیا ہے۔

اس کتاب میں اردو ادب کا تہذیبی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے عنوانات درج ذیل ہیں:

تہذیب کیا ہے؟ تہذیبی ارتقا میں زبان کا تعاون، ہندوستانی تہذیب کی رنگارنگی، ہندوستان کا تہذیبی ارتقا اور اردو، صوفیاے کرام کے اثرات تہذیب و ادب پر، دکنی مسلمان

حکم رانوں کے اثرات، شمالی ہند میں اردو کا عروج، اردو ادب میں جمہوریت و آزادی کا شعور، اردو لکھنؤ کی محفل طرب میں، اردو شاعری میں عوامی زندگی کی ترجمانی، اردو پہلی جنگ آزادی میں، اردو ادب میں ذہنی بیداری، وطن پرستی کا دور، اردو ادب میں فکری و تحریکی بالیدگی، اردو ادب میں نظریاتی مکاتب اور ہندوستان کی تہذیبی ترقی میں اردو کو کیا حصہ لینا چاہیے؟ وغیرہ۔

اردو ادب کا تہذیبی جائزہ لیتے ہوئے مصنف نے ایک جگہ مرثیہ نگاری کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ بات صحیح لکھی ہے کہ:

> "...مرثیے نے چند آئیڈیل دنیا کے سامنے رکھے اور چند معروف تہذیبی اور اخلاقی قدروں کو تاب ناک بنایا۔ شجاعت، عالی ہمتی، انصاف، عصمت و عفت، محبت، اخلاص اور حق کے لیے جان تک کی قربانی وغیرہ ایسی معروف اعلیٰ تہذیبی و اخلاقی قدریں ہیں، جو دنیا کے ہر گوشے میں اور ہر دور میں بنی نوع انسان کا سرمایہ رہی ہیں اور آج بھی ہیں۔ انہی معروف اخلاقی قدروں کا ایک عدیم المثال نمونہ دنیا کے سامنے پیش کر کے مرثیے نے انسانیت کی گراں قدر خدمت انجام دی ہے۔ مرثیے نے ہمہ گیر، لازوال، عالم گیر تہذیبی قدروں کو غیر فانی ثابت کیا..." (ص:۶۲)

اس کتاب میں اردو ادب کے آغاز سے لے کر عہد حاضر تک تخلیق کیے جانے والے شعری و نثری سرمایے کا تہذیبی تناظر میں جائزہ لیا گیا ہے اور اس کے تہذیبی امتیازات نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ مطالعہ اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس میں روایتی سیکولر طرزِ فکر کے برعکس موضوع کو ایک نئے اور متوازن تعمیری طرز فکر کے تحت دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے اور معروضی انداز اختیار کرتے ہوئے تعصب سے گریز کیا گیا ہے۔

اس کتاب کا ایک نقص یہ ہے کہ اس کی ترتیب کتاب کے بجائے مقالے کی ہے، چناں چہ یہ ابواب کے بجائے محض ذیلی عناوین پر مشتمل ہے، لیکن اس کے باوجود مطالعے میں زمانی تسلسل اور تدریجی ارتقا موجود ہے۔ اس سے مصنف کی موضوع سے تفصیلی واقفیت سامنے آتی ہے اور اس کے ذریعہ زیرِ بحث موضوع کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ شعرا و نثر نگاروں اور ادبی ادوار پر تبصرے میں اختصار و جامعیت کے ساتھ توازن کی خصوصیت موجود ہے۔

زیرِ تبصرہ کتاب کی مذکورہ خوبیوں کے پہلو بہ پہلو اس میں کئی خامیاں اور کمیاں بھی ہیں،

جو اس کے معیار کو متاثر کرتی ہیں۔ ان میں سب سے اہم خامی حوالوں کی عدم موجودگی ہے۔ مقالہ نگار نے اسے غالباً جس طرح بلا حوالے کے تحریر کیا تھا، نظر ثانی کے بعد بھی اسی طرح شائع کر دیا ہے اور اردو کے بعض ثقہ تنقید نگاروں کی طرح اقتباس پیش کر کے محض مصنف یا کتاب کا تذکرہ ہی کافی سمجھا ہے، صفحہ نمبر اور دیگر حوالوں کی ضرورت کہیں بھی محسوس نہیں کی ہے۔ علاوہ ازیں اس میں متعدد اشعار بھی غلط تحریر کیے گئے ہیں، صرف ایک مثال کافی معلوم ہوتی ہے:

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے یہ نگر سو سو دفعہ لوٹا گیا (میرؔ)

دوسرا مصرعہ اصلاً یوں ہے: 'یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا'

بعض جگہوں پر ناموں میں بھی غلطیاں ہیں۔ صفحہ ۳۶ پر امین الدین اعلیٰ کو امین الدین علی اور صفحہ ۳۷ پر بابا فرید گنج شکر کو بابا شکر گنج تحریر کیا گیا ہے۔ ایک جگہ کربل کتھا کا مصنف عبداللہ فضلی کو لکھا گیا ہے (ص: ۳۷) جب کہ اس کے مصنف کا نام فضل علی فضلی ہے۔ کتابت کی غلطیاں بھی بہ کثرت ہیں۔

بہ حیثیت مجموعی یہ کتاب اپنے موضوع پر اہمیت کی حامل اور قابلِ مطالعہ ہے۔

(محمد شہاب الدین)

حضرت ابراہیم علیہ السّلام

ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

اس کتاب میں ابوالانبیاء خلیل اللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حیاتِ طیبہ اور دعوتی وتبلیغی جدّ وجہد کا ایک کا جامع مرقع پیش کیا گیا ہے اور ملّتِ ابراہیمی کے بنیادی عناصر، ملّتِ ابراہیمی کے حاملین، ملّتِ ابراہیمی سے انحراف، ملّتِ ابراہیمی اور اسلام، نصاریٰ اور ملّتِ ابراہیمی جیسے اہم موضوعات پر محققانہ اور داعیانہ بحث کی گئی ہے۔ ایک ایسی جامع اور تحقیقی کتاب جو ملّتِ ابراہیمی سے متعارف کرانے کے ساتھ اسوۂ ابراہیمی سے بھی روشناس کراتی ہے۔ صفحات: ۲۹۶ قیمت =/۷۰ روپئے

ملنے کے پتے : ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، پوسٹ بکس نمبر: ۹۳، علی گڑھ-۲
مرکزی مکتبہ اسلامی پبلیشرز، دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی-۲۵

خبر نامہ ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی (۴۸)

☆ صدر ادارہ و امیر جماعت اسلامی ہند مولانا سید جلال الدین عمری کی نئی تصنیف بہ عنوان 'عصر حاضر میں اسلام کے علمی تقاضے' حال میں مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی سے شائع ہوئی ہے۔ یہ کتاب ان مقالات کا مجموعہ ہے جو مختلف اوقات میں سہ ماہی تحقیقات اسلامی اور ماہ نامہ زندگی نو نئی دہلی میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان مقالات میں واضح کیا گیا ہے کہ اگر ہم چاہتے ہیں کہ دنیا اسلام کی طرف متوجہ ہو اور اس کی حقانیت تسلیم کرے تو ہمیں اس کے لیے بھرپور علمی اور فکری تیاری کرنی ہوگی اور اسلام کی روشنی میں موجودہ دور کے مسائل کا حل پیش کرنا ہوگا۔ صفحات: ۸۰، قیمت -/۵۲ روپے

☆ مولانا عمری کی نئی تصنیف 'تجلیاتِ قرآن' کو علمی ، دینی اور تحریکی حلقوں میں غیر معمولی پذیرائی حاصل ہوئی ہے۔ چنانچہ چار ہ ماہ کے مختصر عرصے میں اس کا پہلا ایڈیشن ختم ہوگیا۔ اب مکتبہ سے اس کا دوسرا ایڈیشن کسی قدر نظر ثانی اور کمپوزنگ کی غلطیوں کی اصلاح کے بعد شائع ہوگیا ہے۔ صفحات: ۵۶۰، قیمت -/۳۰۰ روپے

☆ مولانا کی کتاب 'خطباتِ پاکستان' کو بھی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ چنانچہ چھ ماہ کے بعد ہی اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوگیا ہے۔ صفحات: ۱۹۲، قیمت -/۱۰۰ روپے۔ اس کتاب کو پاکستان کے اشاعتی ادارے 'منشورات' نے بھی شائع کیا ہے۔

☆ جماعت اسلامی ہند حلقہ کرناٹک نے ۱۴ تا ۲۸/ جون ۲۰۱۳ء 'مثالی خاندان' کے عنوان سے ریاست گیر مہم منائی۔ اس موقع پر مولانا عمری کے کتابچہ 'قرآن کا نظام خاندان' کو دس ہزار کی تعداد میں چھاپا گیا اور دورانِ مہم بڑے پیمانے پر اسے تقسیم کیا گیا ہے۔ اس مقصد سے اس کا انگریزی اور کنڑ ترجمہ بھی شائع کیا گیا اور دوران مہم تقسیم کیا گیا۔

☆ مولانا محترم نے اپنی کئی کتابوں پر نظر ثانی کی ہے اور حسب ضرورت ان میں ترمیم و اضافہ کیا ہے۔ ان کتابوں کے نئے ایڈیشن مرکزی مکتبہ سے شائع ہوگئے ہیں: اسلام کا عائلی نظام، صفحات: ۲۰۰ ، قیمت -/۹۰ روپے ، بچے اور اسلام، صفحات: ۱۶، قیمت -/۱۰ روپے۔ جماعت اسلامی ہند: پس منظر، خدمات اور طریقۂ کار، صفحات: ۷۲، قیمت -/ ۳۵ روپے، بعض

اہم اسلامی اصطلاحات اور ان کی تشریح، صفحات: ۳۲، قیمت -/۱۸ روپے، اسلام اور وحدت بنی آدم، صفحات: ۳۲، قیمت -/۱۶ روپے۔

☆ 'عورت اور اسلام' مولانا کی مقبول کتابوں میں سے ہے۔ انگریزی، ہندی اور گجراتی میں اس کا ترجمہ پہلے ہو چکا تھا۔ اس کا تمل ترجمہ اسلامک فاؤنڈیشن ٹرسٹ چنّئی سے ۲۰۱۰ء میں شائع ہوا تھا۔ ۲۰۱۱ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن آیا ہے، کتاب بہتر معیار سے شائع ہوئی ہے۔ آخر میں انڈکس بھی شامل کیا گیا ہے۔ صفحات: ۲۲۴، قیمت -/۸۰ روپے

☆ اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی نے مولانا عمری کی تمام تصانیف کو شائع کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ حال میں اس نے متعدد کتابچے شائع کیے ہیں: خدا کی غلامی- انسان کی معراج، انسانوں کی خدمت اسلام کی نظر میں، بعض اہم اسلامی اصطلاحات اوران کی تشریح، اسلام اور مشکلاتِ حیات۔

☆ ۳۰/ اپریل ۲۰۱۳ء کو ادارۂ تحقیق کے کانفرنس ہال میں 'تجلیاتِ قرآن' کے تعارف و تجزیے پر مشتمل ایک پروگرام منعقد ہوا۔ اس کی صدارت پروفیسر اشتیاق احمد ظلی، ناظم دارالمصنفین اعظم گڑھ نے کی۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے اساتذہ پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی، پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی، پروفیسر سید مسعود احمد اور رکن ادارہ مولانا محمد جرجیس کریمی نے کتاب کے مباحث پر اظہارِ خیال کیا۔ آخر میں مولانا عمری کا کلیدی خطاب ہوا۔ پروگرام میں مرد وخواتین کی بڑی تعداد شریک ہوئی۔

☆ بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی اسلام آباد (پاکستان) میں ۲۹-۳۰/ اپریل ۲۰۱۳ء کو ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہوئی، جس کا مرکزی موضوع تھا 'برصغیر میں ترجمۂ قرآن کی مشکلات ومسائل'۔ اس کے انعقاد میں یونی ورسٹی کے تین شعبوں: ادارۂ تحقیقات اسلامی، شعبۂ ترجمہ وتشریح (فیکلٹی آف عربک) اور شعبۂ تفسیر وعلوم قرآنی (فیکلٹی آف اسلامک اسٹڈیز) نے حصہ لیا تھا۔ معاون مدیر مجلّہ ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی نے اس میں شرکت کی اور 'ترجمۂ قرآن پر رجحانات ومسالک کے اثرات' کے موضوع پر مقالہ پیش کیا۔

☆ ادارۂ تحقیق کے منصوبہ کے تحت تیار کی گئی ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی کی کتاب 'حضرت ابراہیم- حیات، دعوت اور عالمی اثرات' چند سال قبل مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز سے

شائع ہوئی تھی۔اب پاکستان میں اسے بک کارنر شوروم جہلم نے بھی شائع کر دیا ہے۔

☆ سابق رکنِ ادارہ ڈاکٹر محمد شمیم اختر قاسمی نے ادارہ کے منصوبہ کے تحت 'سیرتِ نبوی پر اعتراضات کا جائزہ' کے موضوع پر کام کیا تھا۔ ان کی کتاب مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز سے شائع ہوگئی ہے۔صفحات: ۲۸۰ ، قیمت -/۱۳۰روپے۔موصوف ان دنوں عالیہ یونی ورسٹی کلکتہ میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔

☆ گزشتہ ایک سال کے دوران ادارہ کے دو اراکین نے اپنے علمی وتحقیقی کام مکمل کر کے ادارہ کے حوالے کر دیے ہیں۔مولانا محمد جرجیس کریمی نے 'احیائے اسلام: مفہوم، مسائل اور تقاضے' کے موضوع پر اور مولانا ضمیر الحسن فلاحی نے 'ملتِ اسلامیہ: گروہی ومسلکی اختلافات' کے موضوع پر کام کیا ہے۔

☆ ادارہ کے سلسلۂ توسیعی خطبات کے تحت ۱۴/اپریل ۲۰۱۳ء کو ایک خطبہ بہ عنوان 'غربت اور مسلمان: مائیکروفائنانس کے تناظر میں' جناب ارشد اجمل صاحب (پٹنہ) نے پیش کیا۔مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ سے وابستہ اور علی گڑھ میں مقیم دیگر اہل علم کثیر تعداد میں شریک ہوئے اور اپنی تجاویز، مشوروں اور سوالات سے انھوں نے اس موضوع سے دل چسپی کا اظہار کیا۔

☆ جیسا کہ اس سے قبل اعلان کیا جا چکا ہے، ادارہ کی مجلس منتظمہ نے ۲۰۱۴ء کے اوائل میں ایک سمینار کے انعقاد کا فیصلہ کیا ہے۔اس سلسلے میں اس کے مرکزی موضوع اور ذیلی عناوین کی تعیین کے لیے مقامی اہل علم کی دو نشستیں منعقد کی گئی ہیں۔قارئین سے گزارش ہے کہ اس سلسلے میں اگر کوئی مشورہ یا تجویز دینا چاہیں تو سکریٹری ادارہ سے رابطہ کریں۔

☆ گزشتہ دنوں ادارہ کے کیمپس سے متصل ڈیڑھ سو مربع گز زمین پر تعمیر شدہ ایک دو منزلہ مکان کی خریداری کا کام انجام پایا۔ فالحمد للہ علی ذلک۔

پاکستان میں سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی کے لیے رابطہ کریں:
جناب سجاد الٰہی صاحب، A-27، لوہا مارکیٹ، مال گودام روڈ، بادامی باغ، لاہور
Tel: 0300-4682752, (R)5863609, (0)7280916
Email: abdulhadi_133@yahoo.com

R.No. 38933/81 | Quartely | Mob. 09897655171
Tahqeeqat-e-Islami | Phone: 0571-2902034
July.....2013 | Aligarh | September.....2013

مولانا سید جلال الدین عمری کی مطبوعات

شمار	نام کتاب	قیمت	شمار	نام کتاب	قیمت
۱	تجلیات قرآن	۳۲۵/	۲۲	خطبات پاکستان	۱۰۰/
۲	اسلام- انسانی حقوق کا پاسبان	۵۵/	۲۳	عصر حاضر میں اسلام کے علمی تقاضے	۵۲/
۳	غیر اسلامی ریاست اور مسلمان	۲۵/	۲۴	انسان اور اس کے مسائل	۴۰/
۴	کم زور اور مظلوم اسلام کے سایہ میں	۵۰/	۲۵	اسلام اور مشکلات حیات	۲۵/
۵	صحت و مرض اور اسلامی تعلیمات	۲۰۰/	۲۶	خدا کی غلامی- انسان کی معراج	۱۴/
۶	خدا اور رسول کا تصور- اسلامی تعلیمات میں	۸۰/	۲۷	اسلام اور وحدت بنی آدم	۱۶/
۷	معروف و منکر	۸۵/	۲۸	اسلام میں خدمت خلق کا تصور	۱۱۰/
۸	اسلام کی دعوت	۱۵۰/	۲۹	انفاق فی سبیل اللہ	۲۰/
۹	غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق	۱۴۰/	۳۰	دولت میں خدا اور بندوں کا حق	۱۲/
۱۰	تحقیقات اسلامی کے فقہی مباحث	۱۰۰/	۳۱	انسانوں کی خدمت- اسلام کی نظر میں	۱۲/
۱۱	عورت- اسلامی معاشرے میں	۱۸۰/	۳۲	جماعت اسلامی ہند- پس منظر، خدمات اور طریقۂ کار	۳۵/
۱۲	مسلمان عورت کے حقوق اور ان پر اعتراضات کا جائزہ	۱۰۰/	۳۳	ہم تحریک اسلامی کے کارکن کیسے بنیں؟	۱۵/
۱۳	عورت اور اسلام	۵۰/	۳۴	ملک و ملت کے نازک مسائل اور ہماری ذمہ داریاں	۳۲/
۱۴	اسلام کا عائلی نظام	۹۰/	۳۵	یہ ملک کدھر جا رہا ہے؟	۲۰/
۱۵	مسلمان خواتین کی ذمہ داریاں	۱۵/	۳۶	وقت حساب	۱۵/
۱۶	قرآن کا نظام خاندان	۱۸/	۳۷	آخرت کے عذاب سے خاندان کو بچایئے	۱۰/
۱۷	بچے اور اسلام	۱۰/-	۳۸	اسلام کا شورائی نظام	
۱۸	اسلام- ایک دین دعوت	۱۰/	۳۹	فقہی اختلافات کی حقیقت	۱۵/
۱۹	دعوت و تربیت- اسلام کا نقطۂ نظر	۵۵/	۴۰	بعض اہم اسلامی اصطلاحات کی تشریح	۱۸/
۲۰	ہندوستان میں اسلام کی دعوت- اہمیت اور تقاضے	۵/	۴۱	سوئے حرم چلا	۳۲/
۲۱	قرآن مجید کا تصور تزکیہ	۱۸/	۴۲	دینی علوم کی تدریس	۱۰/

ملنے کے پتے :

۱- ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی، نبی نگر، پوسٹ بکس نمبر: ۹۳، علی گڑھ-۲

۲- مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، ڈی-۳۰۷، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی-۲۵